اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

دسمبر ۲۰۱۰ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان

جلد ۱۶، شمارہ ۱۲ دسمبر ۲۰۱۰ء

مشمولات

میری بُکّل دے وِچ چور (چور تو میرے دامن کے اندر چھپا بیٹھا ہے) ۲

○توھینِ رسالت
مغرب اور مغرب کے ایجنٹ مسلم حکمرانوں کا رویہ — ادارہ — ۳

○دینی تعلیم اور تناظر
دینی مدارس کے نظام تعلیم کو مزید مؤثر کیسے بنایا جائے؟ — ڈاکٹر محمد امین — ۴
دینی مدارس کو گھیرنے کی حکومت کی نئی چال — مدیر — ۱۳
غامدی مکتب فکر —— علماء کرام کا ردعمل ۱۸

○تعلیم و تربیت
تعلیمی بگاڑ میں اضافے کے لیے: — ادارہ
مرکزی حکومت کی مدہوشی ۲۰
پنجاب حکومت کی گرم جوشی ۲۱
نوجوانوں کے نام ـــ ایک اہم پیغام — ڈاکٹر محمد امین — ۲۲

○تفھیم مغرب
امریکہ اسلام دشمن کیوں ہے؟ — مولانا نور عالم — ۳۳

○تزکیۂ نفس
اکتساب فضائل (۴) — علامہ احمد جاوید — ۴۹
موت —— جسے ہم بھول گئے ہیں — علامہ ابن جوزی — ۵۲
ہماری سرگرمیاں — ادارہ — ۵۵
مدیر کے نام — ادارہ — ۵۶

میری بُکّل دے وِچ چور

یعنی چور تو میرے دامن کے اندر چھپا بیٹھا ہے

یہ غالباً ۱۹۸۵ء کی بات ہے کہ پاکستان کی 'اسلامی تحریک' حسب معمول انتخابات میں شکست کھا گئی۔ اس پر ہمارے دوست مدیر تکبیر محمد صلاح الدین مرحوم اور تحریک کے ایک رہنما کے درمیان طویل بحث چھڑ گئی کہ اس شکست کے اسباب کیا تھے اور ان پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس بحث کی تفصیلات سے قطع نظر ہوا یہ کہ اس بحث سے ہمارے اندر سویا تحقیق کا طالب علم جاگ اٹھا اور ہم نے اپنے تئیں اس بات پر مطالعہ اور غور و فکر شروع کر دیا کہ ان ناکامیوں کا بنیادی سبب کیا ہے۔ ہم بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ مذکورہ تحریک کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ اجتماعی سیاسی جدوجہد کے ذریعے پاکستان میں اسلامی انقلاب لایا جائے جب کہ ہم یہ سمجھے کہ حقیقی انقلاب تو فرد کے دل سے پھوٹتا ہے لہٰذا جب تک فرد نہ بدلے اور افراد کے بدلنے سے معاشرہ نہ بدلے (کہ معاشرہ افراد ہی کا مجموعہ ہوتا ہے) اسلام کے حق میں کوئی انقلاب کیسے آ سکتا ہے؟ گویا اسلامی انقلاب لانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ فرد پر فوکس کیا جائے اور معاشرے کی اصلاح کی جائے۔ جب وہاں تبدیلی آئے گی تو سیاسی تبدیلی اس کے نتیجے میں ضرور آئے گی۔

جب ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ تبدیلی باہر سے نہیں اندر سے آتی ہے تو فطری اور منطقی طور پر اگلا سوال یہ تھا کہ کیا ہمارے اندر وہ تبدیلی واقع ہوئی ہے؟ اور ہم اس کا ادراک کر کے پریشان ہو گئے کہ وہ تبدیلی تو ہمارے اندر بھی پوری طرح واقع نہیں ہوئی۔ گویا جس چور کو ہم باہر تلاش کر رہے تھے وہ تو ہمارے دامن کے اندر چھپا بیٹھا تھا۔ تب سے ہم اپنی اصلاح کی کوشش میں لگ گئے اب اس کا نتیجہ یہ تو نہیں نکلا کہ اس کوشش کے نتیجے میں ہماری مکمل اصلاح ہو گئی ہو لیکن اتنا ضرور ہوا ہے کہ ہماری ذاتی اصلاح کی کوشش اور اس کے لیے فکر مندی کبھی ماند نہیں پڑی ——شائد اللہ تعالیٰ اس ٹوٹی پھوٹی کوشش ہی کو قبول فرما لیں اور بخش دیں کہ وہ غفور بھی ہیں اور رحیم بھی۔

تب سے یہ حال بھی ہے کہ کی صحبت صالحین کی طلب و جستجو رہتی ہے ؎

احبّ الصالحین و لستُ منھم

لعلّ اللہ یرزقنی صلاحاً

امین

مدیر

توہینِ رسالت

مغرب اور مغرب کے غلام مسلم حکمرانوں کا رویہ

ہمارے عہد کے عالم اسلام کا بہت بڑا المیہ اور مسئلہ یہ ہے کہ عوام اور ان کے حکمرانوں میں بُعد ہے۔ عوام اسلام اور اسلامی تعلیمات و اقدار پر عمل چاہتے ہیں جبکہ ان کے حکمران اہل مغرب کے حاشیہ نشین بنے ہوئے ہیں اور اقتدار میں آنے اور رہنے کے لیے مسلم عوام پر انحصار کرنے کی بجائے امریکہ و یورپ کی کفش برداری اور غلامی کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ اس مسئلے پر قابو پانے میں امت ابھی تک ناکام ہے اور اس کے سکالر اور حکمت کار (Strategists) بھی اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کا کوئی قابل عمل حل ابھی تک نہیں ڈھونڈ سکے۔

پچھلے کچھ عرصے سے اہل یورپ نے مسلمانوں کو ذلیل و رسوا اور مشتعل کرنے کا یہ طریقہ ڈھونڈا ہے کہ وہ نبیٔ محترم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی توہین کرتے ہیں تاکہ مسلمان مشتعل ہوں اور انہیں دہشت گرد اور انتہا پسند کہا جاسکے۔ گوری چمڑی والوں کے دیکھا دیکھی مسلمان ملکوں میں کالے عیسائیوں نے بھی پر پُرزے نکالنے شروع کر دیے ہیں اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اہانت کو معمولی بات سمجھتے ہیں اور جب ان کے خلاف قانون حرکت میں آتا ہے تو ایسے شریر اور بد بخت لوگوں کو بچانے کے لیے سارا امریکہ اور یورپ حرکت میں آجاتا ہے۔ اہل مغرب کا یہ طرز عمل افسوسناک ہے لیکن اس سے زیادہ افسوسناک ان مسلم حکمرانوں کا طرز عمل ہے جو مغرب کے دباؤ پر متعلقہ قانون کو ختم یا غیر مؤثر کرنا چاہتے ہیں اور مجرموں کو اہل مغرب کے حوالے کرنا چاہتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے نہ ان کی دینی غیرت کو ٹھیس پہنچتی ہے اور نہ ان کی حمیت جوش میں آتی ہے۔

اللہ ایسے بے غیرت، بزدل اور بے حمیت حکمرانوں سے ہمیں بچائے۔ پاکستانی عوام کو چاہیے کہ اس معاملے میں ہر قسم کے مسلکی اور سیاسی اختلافات سے بالاتر ہوتے ہوئے نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حرمت کے لیے سیسہ پلائی دیوار بن جائیں اور ڈٹ کر اندرونی و بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کریں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

دینی مدارس کے نظام تعلیم کو مزید مؤثر کیسے بنایا جائے؟

۱۸ دسمبر ۲۰۱۰ء کو تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ کے صدر ڈاکٹر محمد امین صاحب کا جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں دینی مدارس کے اساتذہ کی تربیتی نشست سے خطاب (ادارہ)۔

حمد وثناء کے بعد،

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے معاشرے میں جتنا دین باقی ہے اس میں بڑا کردار ان علماء کرام کی قربانیوں کا ہے جنہوں نے بھوکے رہ کر اور آسائشیں تج کر دینی مدارس کو زندہ رکھا، مساجد کو آباد کیا اور معاشرتی رسم و رواج میں دینی تعلیمات کو باقی رکھا خصوصاً انگریزی دور میں جب مسلمانوں کا نظام تعلیم تباہ کر دیا گیا تھا اور مغربی فکر وتہذیب پر مبنی تعلیمی نظام ملک میں رائج کر دیا گیا تھا۔ تاہم اگر اہل مدارس خوگرحمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لیں تو ہم یہ عرض کرنے کی جسارت کریں کہ ہمارا معاشرہ آج دین سے جتنا دور ہے اور تیزی سے ہو رہا ہے اس کی وجہ بھی علماء کرام اور دینی مدارس کے نظام تعلیم کا غیر مؤثر ہو جانا ہے۔

دینی مدارس کے نظام تعلیم میں کن تبدیلیوں کی ضرورت ہے کہ وہ مزید مؤثر ہو جائے اور اپنا کردار احسن طریقے سے ادا کر سکے، ہماری رائے میں اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ دینی مدارس مندرجہ ذیل تین اہم ایشوز پر صحیح مؤقف اختیار کریں:

۱۔ دینی مدارس کے تعلیمی مقاصد پر نظر ثانی

۲۔ مغربی فکر وتہذیب کے بارے میں صحیح ردعمل

۳۔ فرقہ واریت کا خاتمہ

ذیل میں ان مباحث کی کچھ تفصیل دی گئی ہے:

دینی تعلیم کے مقاصد واہداف

برصغیر میں انگریزوں کے غلبے سے پہلے ہندوستان کے مدارس میں وہی نظام تعلیم رائج تھا جو پچھلی

بارہ صدیوں سے مسلمان معاشروں میں مروج تھا یعنی مدارس دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم پرائیویٹ سیکٹر میں دیتے تھے اور ایسے افراد تیار کرتے تھے جو اپنی ذاتی زندگی میں بھی اسلام پر عمل کریں اور معاشرے اور ریاست کو بھی اسلامی تناظر میں چلاسکیں۔ چنانچہ مدارس میں قرآن، حدیث، فقہ اورعربی زبان کے ساتھ طب(میڈیسن)، ہندسہ(انجینئرنگ)،فلکیات(اسٹرانومی)، کیمیا(کیمسٹری) اور ریاضی جیسے سائنسی علوم بھی پڑھائے جاتے تھے اور منطق، فلسفہ، السنہ(زبانیں) ادب، تاریخ، قانون جیسے عمرانی علوم بھی۔خود اس نصاب پر ایک نظر ڈالیں جو ملا نظام الدین سہالویؒ نے برصغیر کے مدارس کے لیے ترتیب دیا تھاتو معلوم ہوگا کہ اس میں قرآن وسنت کا نصاب بہت ہلکا ہے یعنی تفسیر میں صرف بیضاوی اور حدیث میں صرف مشکوٰۃ تھی باقی سارے علوم وہ تھے جن کی مسلم معاشرے اور ریاست کو ضرورت تھی۔

لیکن برصغیر میں جب انگریز نے مسلمانوں کا نظام تعلیم قوت سے ختم کردیا اور اپنا نظام تعلیم جاری کردیا تو علماء کرام ریاست کے وسائل سے محروم ہوگئے اور معاشرہ بھی لوٹ کھسوٹ اور زبوں حالی کا شکار ہوگیا۔تب علماء کرام نے آگے بڑھ کر معاشرے کو جہالت اور بے دینی کے سیلاب سے بچایا او رروکھی سوکھی کھا کر اورمٹی کے حجروں میں بیٹھ کرقرآن وسنت کی تعلیم دی تاکہ مساجد آباد رہیں اور مسلمان نکاح، طلاق، اور شادی وغم کی رسمیں اسلامی تعلیمات کے مطابق ادا کرسکیں۔لیکن پاکستان بننے کے بعد جب ریاست وحکومت مسلمانوں کو منتقل ہوگئی تو اب علماء کرام کا فرض تھا کہ وہ اس عارضی تعلیمی بندوبست کو ترک کردیتے جو وقتی طور پر انہوں نے انگریزی اقتدار کی وجہ سے اختیار کیا تھا اور اس مستقل نظام تعلیم کی طرف مراجعت کرلیتے جو اسلاف کا منہج تھا اور صدیوں سے مسلم معاشرے میں جاری تھا یعنی وہ رجال کار تیار کرتے مسلم معاشرے اور ریاست کے لیے نہ کہ صرف مساجد و مدارس کے لیےلیکن بوجوہ علماء کرام یہ نہ کرسکے۔

علماء کرام کے اس مطلوبہ تبدیلی کو قبول نہ کرنے کے دو بہت بڑے نقصان ہوئے۔ ایک یہ کہ معاشرے اور ریاست کو چلانے والے افراد تیار نہ کرکے گویا انہوں نے معاشرے اور ریاست کو چلانے کا کام خود ان لوگوں کے سپرد کردیا جو مغرب سے مرعوب تھے ،غلامانہ ذہنیت رکھتے تھے اور

اقتدار کی خاطر اپنے سابقہ آقاؤں کے ایجنٹ بن کر مسلم معاشرے اور ریاست کو اسلام کی بجائے مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب کے مطابق چلانا چاہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس سے دین و دنیا میں تفریق اور سیکولرزم کی وہ دراڑ جو قرن اوّل میں حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت کے بعد اہل علم و اصلاح کی حکومت و ریاست سے بُعد کی وجہ سے مسلم معاشرے میں پیدا ہوئی تھی اب ناقابل عبور شگاف کی صورت اختیار کر گئی نتیجتاً مسلم معاشرے میں مسٹر اور ملا اور مذہبی و غیر مذہبی شخصیت کی تفریق اسلام کی بنیادی اقدار کی نفی کر رہی ہے۔

دینی مدارس چلانے والے علماء کرام سے اگر کبھی اس موضوع پر بات ہو تو وہ کہتے ہیں کہ یہ حکومت کا کام ہے کہ وہ ملک کے عمومی تعلیم کے ادارے چلائے ہم تو رو پیٹ کر اور کھینچ تان کر اپنے مدارس ہی چلالیں تو یہ بہت بڑا کام ہے۔ ہمیں علماء کرام کے اس جواب سے ہرگز اتفاق نہیں کیونکہ جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا کہ مسلمانوں کا پورا نظام تعلیم صدر اسلام سے علماء کرام کے ہاتھوں میں اور پرائیویٹ سیکٹر میں رہا ہے اور معاشرہ اور حکومت دونوں اس کام میں ان کی غیر مشروط امداد کرتے رہے ہیں۔ آج بھی اگر وہ اسے چلانے کے لیے کھڑے ہوجائیں تو معاشرہ ضرور ان کا ساتھ دے گا خواہ حکومت نہ بھی دے۔ علماء کرام کے اسی رویے کا شاخسانہ ہے کہ عام افراد معاشرہ روایتی مدرسے اور درس نظامی کو تو دینی کام اور کار ثواب سمجھتے ہیں لیکن ہماری طرح کا اِکا دُکا آدمی اگر اس پورے کام کو کرنا چاہے جو ماضی میں مدارس انجام دیتے تھے تو عوام اسے 'دینی کام' ہی نہیں سمجھتے جو باعث ثواب ہو۔ غرض یہ کہ علماء کرام اور دینی مدارس کو بغیر تاخیر کے یہ فیصلہ اب کر لینا چاہیے کہ وہ تعلیم صرف مسجد اور مدرسے کے لیے رجال کار تیار کرنے کے لیے نہیں دیں گے بلکہ اس کے ساتھ معاشرے اور ریاست کے کارکن بھی انہوں نے تیار کرنے ہیں؟ ہماری رائے میں جب تک وہ یہ صحیح فیصلہ نہیں کریں گے معاشرے میں دینی مدارس اور ان کے فضلاء کا کام ناقص اور غیر مؤثر رہے گا اور معاشرہ بداخلاقی اور مغربی فکر و تہذیب کی پیروی کے اندھے راستے پر بگٹٹ دوڑتا رہے گا۔ یہ ہماری رائے ہے جب کہ بعض سخت مزاج لوگ ایسے بھی ہیں جو دینی مدارس کے اس رویے کو صریحاً غیر اسلامی رویہ سمجھتے ہیں۔

مغربی فکر وتہذیب کے بارے میں ردعمل

دوسرا بہت اہم معاملہ جس کے بارے میں دینی مدارس کو اپنے فیصلے پر فوری نظر ثانی کی ضرورت ہے وہ مغرب کی ملحدانہ اور اسلام مخالف فکر وتہذیب کے بارے میں ان کا رویہ ہے۔مغربی تہذیب کے بارے میں علماء کرام کے رویے کو جذبات پر مبنی نفرت اور صَرفِ نظر کا رویہ کہہ سکتے ہیں جو ملک اور ملت کے لیے انتہائی مضر ثابت ہورہا ہے۔انگریز چونکہ غاصب اور ظالم تھا اور مسلمانوں خصوصاً علماء کرام کو کچل کر برصغیر میں حاکم بنا تھا اور اس نے مسلم اداروں خصوصاًان کے نظام تعلیم کا بھی خاتمہ کیا تھا جو مدارس کی صورت میں علماء کرام کے ہاتھوں میں تھا، اس لیے علماء کرام کی انگریز سے نفرت بجا تھی اور ان کا 'ہم اس کافرانہ نظام سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے' کا رویہ بھی جواز رکھتا تھا لیکن اب لاتعلقی کا یہ رویہ امت کے لیے بہت نقصان کا باعث بن رہا ہےجس کے چند بڑے مظاہر یہ ہیں:

۱۔ نظام تعلیم کا کچھ جزوی حصہ تو علماء کرام کے ہاتھوں میں رہا جس پر انہوں نے خوب کام کیا لیکن باقی ساری تعلیم انگریز اور اس کی فکر سے مرعوب مسلمانوں کے ہاتھوں میں چلی گئی اور وہ غیر اسلامی خطوط پر ترقی کرتی رہی یہاں تک کہ آج سکول سے لے کر یونیورسٹی تک جو تعلیمی ادارے معاشرے اور ریاست کو چلانے والے رجال کار تیار کررہے ہیں ان میں نہ دینی تعلیم ہے نہ تربیت۔حکومت پاکستان کے اعداد وشمار کے مطابق صرف پرائمری سطح پر داخلہ لینے والے طلبہ کی تعداد ۵ کروڑ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان کروڑوں مسلمان بچوں کی دینی تعلیم وتربیت نہ کرنے کی ذمہ داری سے علماء کرام کیسے بری الذمہ ہوسکتے ہیں؟ یادرہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد سے دونسلیں مغرب سے مرعوبیت اور اسلام سے بُعد پر مبنی یہ تعلیم حاصل کرچکی ہیں اور وہی آج ملک اور معاشرہ چلارہی ہیں اور معاشرے میں سارا اخلاقی بگاڑ انہی کا لایا ہوا ہے کیونکہ ان کی تعلیم وتربیت میں اہل دین اور علماء کا کوئی کردار ہے ہی نہیں یا محض برائے نام ہے۔

۲۔ استعمار سے نفرت اور لاتعلقی کی جذباتی فضاء میں علماء کرام نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ مغرب کا فکر وفلسفہ ہے کیا؟ ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ یہ غیر اسلامی ہے لیکن اب جب کہ استعمار

یہاں سے بظاہر چلا گیا اور خود مدارس کے اندر سے دو نسلیں اس حالت میں گزر گئیں تو اب مدارس کے طلبہ میں مغرب سے جذباتی نفرت کی تندی بھی باقی نہیں رہی اور انہیں یہ بھی خبر نہیں کہ مغربی فکر و تہذیب ہے کیا؟ جب کہ معاشرے کی یہ حالت ہے کہ نہ صرف عام تعلیم کا سارا ڈھانچہ مغرب زدہ ہوگیا ہے بلکہ پورا معاشرہ مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کا نخچیر ہو چکا ہے اور پوری معاشرتی فضاء مغرب کی اندھی نقالی کی نذر ہوگئی ہے۔ ان حالات میں دینی مدارس کا مغربی فکر وتہذیب سے لاتعلقی کا رویہ سخت نقصان دہ ہے اور اس امر کی فوری ضرورت ہے کہ علماء کرام مغربی فکر وتہذیب کا مطالعہ کریں اور دینی مدارس میں طلبہ کو باقاعدہ ایک مضمون کی صورت میں پڑھائیں تاکہ وہ جان سکیں کہ مغرب کی فکر وتہذیب کیسے ملحدانہ اور اسلام دشمن ہے تاکہ یہ طلبہ جب فارغ التحصیل ہوکر معاشرے میں جائیں تو یہ ان کے جمعہ کے مواعظ اور درس وتدریس کا حصہ بنے۔

۳۔ علماء کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ امت مسلمہ ایک مشنری امت ہے اور علماء کرام کا بنیادی کام ہی دین کی دعوت لوگوں تک پہنچانا ہے خواہ مخاطب مسلمان ہوں یا غیر مسلم لیکن دعوت وتبلیغ اور تزکیہ واصلاح کا کام اس وقت تک مؤثر طور پر نہیں ہوسکتا جب تک آپ مخاطب کے ذہن اور اس کی فکری بناوٹ کو نہ سمجھتے ہوں۔ اب مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب دنیا کی غالب فکروتہذیب ہے اور مسلم وغیر مسلم سب اس سے متاثر ومرعوب ہیں خواہ وہ پاکستان میں ہوں یا ہندوستان میں، ایشیا میں ہوں یا افریقہ میں اور یورپ میں ہوں یا امریکہ میں۔ لیکن دینی مدارس میں علماء کرام نے چونکہ مغربی فکروتہذیب کا مطالعہ نہیں کیا ہوتا اس لیے نہ وہ مغربی تہذیب کو سمجھتے ہیں اور نہ اس کی فکری بنیادوں کو اور نہ اس سے متاثر اذہان کے اشکالات کو — اس پس منظر میں علماء کرام نہ تو مسلمانوں کی اصلاح وتزکیے کے لیے مؤثر انداز میں کام کر سکتے ہیں، نہ وہ مغربی تہذیب سے مرعوب مسلمانوں کے ذہنی و فکری مسائل سمجھ سکتے ہیں اور نہ غیر مسلموں تک موزوں اسلوب و انداز میں دعوت دین پہنچا سکتے ہیں خصوصاً جب کہ ان کے ہاں انگریزی اور دیگر زبانیں پڑھنے کا رواج ہی نہیں۔

۴۔ مغربی فکر وتہذیب کا غیر اسلامی بلکہ اسلام دشمن ہونا واضح ہے لیکن جب تک علماء کرام اس فکر

وتہذیب کا مطالعہ نہ کریں گے اور اسے اچھی طرح نہیں سمجھیں گے وہ اس کا رد کیسے کریں گے؟ امام غزالیؒ نے جب یونانی فلسفہ کو رد کرنا چاہا تو پہلے انہوں نے یونانی فلسفے کا مطالعہ کیا اور اسے سمجھا اور مقاصد الفلاسفہ لکھی، پھر اس کا رد کیا اور تہافۃ الفلاسفہ لکھی۔ یہی کام کی صحیح ترتیب ہے کہ آج بھی علماء کرام پہلے مغربی فکر و فلسفے کو پڑھیں، اسے سمجھیں اور پھر اس کا رد کریں۔ اسے پڑھے اور سمجھے بغیر وہ اس کا رد کس طرح کر سکتے ہیں؟

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دینی مدارس میں مغربی فکر وتہذیب کا مطالعہ ناگزیر ہے اور اسے نصاب کا حصہ بننا چاہیے ورنہ دینی مدارس کے فضلاء عصر حاضر کی فکر اور اس کے تحدیات کو سمجھنے اور ان کا حل پیش کرنے میں ناکام رہیں گے۔

فرقہ واریت کا رد

تیسرا بڑا مسئلہ جس کے بارے میں دینی مدارس کو ایک متوازن اور فیصلہ کن رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے وہ فرقہ واریت ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ علماء کے درمیان علمی وفکری اختلاف ہونا ایک فطری اور منطقی امر ہے اور یہ ہرگز قابل مذمت نہیں۔ اسی طرح بعض فقہی اور کلامی اختلافات مسالک اور مکاتب فکر کی صورت اختیار کر چکے ہیں جیسے ائمہ اربعہ کے مابین اختلافات یا اہل الرائے اور اہل الحدیث کا اختلاف یا اہل سنت اور اہل تشیع کا اختلاف۔ لیکن یہ مکاتب فکر اور مسالک صدیوں کا تاریخی سفر طے کرنے کے بعد معروف اور پختہ ہو چکے ہیں اور اب انہیں سبب نزاع وتعصب بنانے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ان کی بنیاد پر معاشرے کو تقسیم کرنے اور لڑانے کی کوئی گنجائش ہے۔ ہماری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ دینی مسالک کو باہم لڑانے کا کام ہمارے یہاں پہلے انگریز اور اس کی خفیہ ایجنسیوں نے کیا اور اب ان کی مدد کے لیے ان کے غلام مسلمان حکمران اور ان کی خفیہ ایجنسیاں بھی اس گناہ بے لذت میں شریک ہوگئی ہیں۔ لہٰذا یہ علماء کرام کی فراست و اخلاص کا امتحان ہے کہ وہ ان ایجنسیوں کے قابو نہ آئیں اور ان کے ہاتھوں میں نہ کھیلیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثال مسلک کی بنیاد پر بننے والی دینی سیاسی جماعتیں ہیں۔ جس آدمی کے پاس ذرا سی بھی عقل ہو وہ سمجھ سکتا ہے کہ اگر دینی مسلک کی بنیاد پر سیاسی جماعت بنے گی تو ایک مسلک کے حامل دوسرے مسلک کی سیاسی

جماعت کو ووٹ نہیں دیں گے لہٰذا مسلک کی بنیاد پر بنی ہوئی سیاسی جماعت قیامت تک انتخابات میں کامیاب نہیں ہوسکتی اور اقتدار میں نہیں آسکتی اس کے باوجود ایجنسیوں نے بعض علماء کو انگیخت کر کے ہر دینی مسلک کی سیاسی جماعت بنوائی اور انہیں آپس میں خوب لڑایا جس کے نتیجے میں ان کے حصے میں ناکامی آئی، دین کی ہوا خیزی ہوئی اور سیکولر سیاسی جماعتوں کو حکمرانی کا موقع ملا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ آئین پاکستان کی رو سے زبان، نسل، رنگ، علاقے، مسلک کی بنیاد پر سیاسی جماعت بنانا ممنوع ہے لیکن ہماری اسٹیبلشمنٹ دینی جماعتوں کو باہم لڑانے کے لیے آئین پر عمل کی بات ہی نہیں کرتی۔

دوسرا خنّاس جو ان ایجنسیوں نے ہمارے دینی مسالک کے نچلی سطح کے واعظین کے دماغوں میں بھر دیا ہے وہ یہ ہے کہ حق صرف ہمارے مسلک میں منحصر ہے اور باقی سب مسالک والے کافر یا کم از کم گمراہ ضرور ہیں۔ ذرا تصور کیجیے کہ ہمارے ملک میں تقریباً ۸۰ فیصد احناف ہیں لیکن انہیں دیوبندی اور بریلوی میں تقسیم کر کے انہیں متحارب دھڑے بنا دیا گیا ہے اور کسی کو اس کا احساس تک نہیں۔ یہی حال دوسرے مسلکوں کا ہے۔

ہم پھر کہتے ہیں کہ علماء کرام کے درمیان اختلافات موجود ہیں اور یہ ہرگز قابل مذمت نہیں۔ جہاں بھی اہل علم اور سوچنے سمجھنے والے لوگ ہوں گے فکر و نظر میں اختلاف ہوگا لیکن ان اجتہادی اور فروعی اختلافات کو تعصب میں بدلنا اور اس بناء پر معاشرے کو تقسیم کرنا قابل مذمت ہے اور یہی فرقہ واریت ہے جو بُری ہے۔ آیئے ایک نظر اس پر ڈالیں کہ مغربی اور پاکستانی حکمرانوں اور ان کی خفیہ ایجنسیوں نے کس طرح اپنے انتظامی اقدامات کے ذریعے اور چھوٹی سطح کے بعض واعظین اور علماء کو اپنا آلۂ کار بنا کر فرقہ واریت کے عفریت کو زندہ رکھا ہوا ہے بلکہ اسے پال پوس کر بڑھا رہے ہیں:

ا۔ حکومت نے مساجد اور مدارس کو مسلکوں میں بانٹنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور وہ اس طرح کہ حکومت مسلک کی بنیاد پر رجسٹریشن قبول کرتی ہے۔ اگر حکمران اس کی حوصلہ شکنی کرنا چاہتے تو کہہ سکتے تھے کہ مسجد کے نام میں اگر فرقہ واریت ہوئی تو رجسٹریشن نہیں ہوگی۔ اگر ایسا ہوتا تو مسجدیں اللہ

کا گھر ہی رہتیں فرقہ واریت کا گڑھ نہ بنتیں۔

۲۔ دینی تعلیم کا ایک ہی وفاق بن سکتا تھا اور آج بھی بن سکتا ہے اور وہ یوں کہ اس کے دو سیکشن بنا دیئے جائیں ایک اہل سنت کا اور دوسرا اہل تشیع کا۔ اہل سنت کے سیکشن میں بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث اور جماعت اسلامی کا نصاب ایک ہو البتہ کتابیں مختلف رکھنے کی اجازت ہو — یاد رہے کہ اہل سنت کے ان چاروں وفاقوں کو آسانی سے ایک نصاب پر جمع کیا جا سکتا ہے بلکہ ان کا نصاب اس وقت بھی تقریباً یکساں ہی ہے لیکن حکومت نے جان بوجھ کر اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پانچ وفاق بنائے ہیں تاکہ ہر فرقے کا الگ وفاق ہو، الگ نصاب اور کتابیں ہوں تاکہ فرقہ واریت پھلتی پھولتی اور مستحکم ہوتی رہے۔

۳۔ مرکز اور صوبوں میں اوقاف کی وزارتیں اور محکمے موجود ہیں جن کے پاس سیکڑوں مسجدیں اور بیسیوں دینی مدارس ہیں جن میں ہزاروں خطیب، امام، مؤذن اور علماء کرام ملازمت کرتے ہیں لیکن یہ سارا کام بھی مسلک کی بنیاد پر ہوتا ہے اور کسی حکومت نے کبھی کوشش نہیں کی کہ ان اداروں کا نظم و نسق غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر چلایا جائے۔

۴۔ دینی مدارس کے اساتذہ کی تربیت کی جاسکتی ہے کہ وہ دوران تدریس دوسرے مسالک کے رد میں مبالغہ آرائی نہ کریں اور ان کے خلاف تعصب نہ پھیلائیں لیکن حکومت نے دینی مدارس کے اساتذہ کی تربیت کی کبھی کوشش نہیں کی۔

۵۔ حکمران اگر اخلاص سے دینی مدارس کے نظام اور نصاب کی اصلاح چاہتے تو یہ ہرگز مشکل نہ تھا اور نہ آج مشکل ہے لیکن اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کام کے لیے معتدل مزاج اور جہاندیدہ علماء کرام کی ایک کمیٹی بنا دی جائے اور حکومت کا ایک آدھ ایسا آدمی، جو علماء کے لیے قابل قبول ہو، ان کے درمیان رابطے کا کام کرے اور ضروری سہولتیں مہیا کرے۔ لیکن ہماری مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتیں کروڑوں بلکہ اربوں روپے تعلیم پر خرچ کرتی ہیں لیکن انہوں نے کبھی ایک دھیلا دینی مدارس کو نہیں دیا۔ الٹا مغربی حکومتوں کے دباؤ پر مدارس کو جکڑنے، پابند بنانے اور ان کے نصاب

میں تبدیلیاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پھر دینی مدارس اگر ان حکومتی اقدامات کی مزاحمت نہ کریں تو کیا کریں؟

خلاصہ یہ کہ مغربی حکومتیں اور ان کی ایجنسیاں اور ان کی اقتداء میں ان کے غلام اور ایجنٹ مسلم حکمران، دینی مدارس و مساجد اور علماء کرام میں فرقہ واریت پھیلانے اور مسلک پرستی کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں اور یہ محض ڈھونگ ہے کہ وہ اسے ختم کرنا چاہتے ہیں۔

باتیں تو اگرچہ اور بھی ہیں اور وہ اہم بھی ہیں مثلاً طلبہ کی تربیت کا مسئلہ، معیار تعلیم کو بہتر بنانے کا مسئلہ، نصاب پر نظر ثانی اور اساتذہ کی تربیت کا مسئلہ لیکن ہم طوالت سے بچنے کی خاطر صرف ان تین نکات پر اکتفا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے اس کی تلخیص کے طور پر عرض کرتے ہیں کہ جب تک دینی مدارس:

اوّلاً: اپنے مقاصد تعلیم کو تبدیل نہیں کرتے اور صرف مساجد و مدارس کے لیے رجال کار مہیا کرنے کی پالیسی تبدیل کر کے معاشرے اور ریاست کے لیے کارکن مہیا کرنے کو بھی اپنے دائرہ کار میں شامل نہیں کرتے:

ثانیاً: جب تک وہ مغربی فکر و تہذیب اور اس کے علوم کے مطالعے کو شامل نصاب نہیں کرتے اور اسے اچھی طرح سمجھ کر دلائل کی بنیاد پر اسے رد کرنے کی صلاحیت کے حامل نہیں ہو جاتے:

ثالثاً: فرقہ واریت کے عفریت سے اپنی جان چھڑانے کا اہتمام نہیں کرتے:

اس وقت تک نہ تو وہ معاشرے کا حقیقی جزو بن کر اس سے مربوط ہو سکتے ہیں اور نہ وہ مؤثر طور پر اس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور نہ وہ فرد اور معاشرے کی ایسی اصلاح کر سکتے ہیں کہ لوگوں کے لیے دینی تعلیمات پر عمل آسان ہو جائے اور وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہو سکیں۔ لہٰذا یہ وقت کا تقاضا اور ضرورت ہے کہ علماء کرام ان معاملات پر غور فرمائیں اور ان کے حوالے سے ایک صحیح اور مضبوط مؤقف طے کریں اور اس پر عمل درآمد کریں تاکہ دینی مدارس معاشرے میں اپنا کردار مؤثر طریقے سے ادا کر سکیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

دینی مدارس کو گھیرنے کی حکومت کی نئی چال

عام لوگ بھی یہ بات جانتے ہیں اور علماء کرام و دینی مدارس چلانے والوں کا تو روز کا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں کو دینی مدارس اور ان کے نظام تعلیم کی بہتری اور افزونی کوئی دلچسپی نہیں۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں کروڑوں اور اربوں روپے مغرب زدہ جدید تعلیم پر ہر سال خرچ کرتی ہیں لیکن دینی مدارس پر وہ ایک روپیہ خرچ کرنے کو تیار نہیں اور جب بھی بیرونی قوتوں خصوصاً امریکہ و یورپ کا دباؤ پڑتا ہے وہ مدارس پر سختی اور پکڑ دھکڑ شروع کر دیتے ہیں۔

اس پس منظر میں حال ہی میں وزارت داخلہ کی زیر نگرانی مدرسہ ایجوکیشن بورڈ اور دینی تعلیم دینے والے وفاقوں کی تنظیم 'اتحاد تنظیمات مدارس' (جس میں ہر وفاق کا صدر اور ناظم اعلیٰ شامل ہوتے ہیں) کے درمیان جو اصولی معاہدہ ہوا ہے اس پر بعض دینی مدارس کے تحفظات بے جا محسوس نہیں ہوتے۔ اس معاہدے میں ابتدائی طور پر یہ طے پایا ہے کہ دینی مدارس میٹرک اور ایف اے کا حکومتی نصاب پڑھائیں گے اور دینی تعلیم کے وفاقوں کو بطور بورڈ ان کا امتحان لینے اور ڈگری جاری کرنے کا اختیار ہوگا۔ ان مجوزہ بورڈوں میں مذکورہ امتحان لینے کے انتظامات میں حکومت کے افراد بھی شامل ہوں گے اور ان بورڈوں کے اوپر نگرانی کے لیے ایک حکومتی ادارہ (غالباً موجودہ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ) موجود ہوگا۔ ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ کے دسمبر کے شمارے میں مولانا محمد حنیف جالندھری صاحب اور جامعہ امدادیہ فیصل آباد کے مولانا محمد زاہد صاحب کے مضامین شائع ہوئے ہیں جو اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہیں۔ موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات انہیں ضرور ملاحظہ فرمالیں۔

اس معاملے میں ہماری رائے یہ ہے کہ:

۱۔ یہ معاہدہ حکومت کی طرف سے مدارس کو گھیرنے کی ایک نئی چال ہے۔ مرکزی حکومت کی ژولیدہ

فکری اور مدارس سے عدم دلچسپی کا تو یہ حال ہے کہ ابھی اس نے یہ بھی طے نہیں کیا کہ مرکزی حکومت کی کون سی وزارت اور شعبہ مدارس کو ڈیل کرے گا۔ وزارت داخلہ اسے امن و امان اور سیکورٹی کا مسئلہ سمجھتی ہے کہ ان کے آقایان ولی نعمت مدارس کو دہشت گردی اور انتہاپسندی کے مراکز سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک وہ سیکورٹی رسک ہیں۔ وزارت مذہبی امور، مذہبی تعلیم کو ایک مذہبی معاملہ سمجھ کر دینی مدارس سے ڈیل کرنا چاہتی ہے جبکہ تعلیم اور خصوصاً نصاب وغیرہ مرکزی وزارت تعلیم کا شعبہ ہے۔ بہرحال مذکورہ معاہدہ وزارت داخلہ کی نگرانی میں ہوا ہے جس میں مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے سربراہ فعال کردار ادا کر رہے ہیں جو سابق سیکرٹری وزارت مذہبی امور ہونے کی وجہ سے دینی وفاقوں کے ذمہ داران سے قریبی تعلقات بھی رکھتے ہیں۔ یہ بات بہرحال ظاہر ہے کہ حکومت جو کچھ کر رہی ہے وہ مغربی دباؤ کے تحت کر رہی ہے جہاں سے اسے اس مد میں کافی پیسے بھی ملے ہوئے ہیں (جنہیں استعمال کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تحرک ضروری ہے) اور اسے ایک انتظامی اور امن و امان کا مسئلہ سمجھ کر ڈیل کر رہی ہے۔ حکومت کا ایک نعرہ مدارس کی تعلیم کو مین اسٹریم یعنی تعلیم کے مرکزی دھارے کے ساتھ ملانا بھی ہے۔ لہٰذا اگر مدارس حکومتی سکیم اور نصاب کے مطابق میٹرک، ایف اے کرانے پر تیار ہوجائیں تو واقعی یہ حکومت کی کامیابی ہے۔ مدارس کا خدشہ اس ضمن میں یہ ہے کہ اگر وہ تعلیم کے مرکزی دھارے میں شریک ہوگئے تو جلد یا بدیر ان کی شناخت اور وجود گم ہوجائے گا اور حکمرانوں کے رویوں کے پیش نظر مدارس کے اس خدشے میں وزن بھی محسوس ہوتا ہے۔

۔ سوال یہ ہے کہ اس معاہدے میں دینی مدارس کے وفاقوں کے پیش نظر کیا ہے؟ اگر وہ اصلاح کے خواہش مند اور دینی مدارس کے کردار کو مزید مؤثر بنانا چاہتے ہیں تو یہ خواہش فطری اور جینوئن ہے لیکن معروضی حالات کا تقاضا ہے کہ مدارس یہ کام خود کریں اور اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھیں اور اس میں حکومت کو شامل نہ کریں۔ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ’اتحاد تنظیمات مدارس‘ سارے وفاقوں کے دو دو موزوں ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی بنادے جو اس ضمن میں سفارشات تیار کرے اور ہر وفاق اپنے اپنے پلیٹ فارم پر بحث و مناقشہ کے بعد اسے منظور کر کے اپنا لے۔ ’اتحاد تنظیمات مدارس‘ کے

ذمہ داران اگر مناسب سمجھیں تو ان سفارشات کو پبلک بھی کر دیں تاکہ مدارس کے بہی خواہ اور ان کے معاملات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات بھی اگر کوئی مشورہ دیں تو اسے بھی زیر غور لے آیا جائے کہ مشاورت میں بہرحال خیر ہی خیر ہے (اس ضمن میں راقم نے تو ابتداء بھی کر دی ہے اور 'دینی مدارس کے نظام تعلیم کو مؤثر کیسے بنایا جائے؟' کے موضوع پر ایک تحریر البرہان کے تازہ شمارے میں موجود ہے)۔

۔ زیر بحث معاہدے کے حوالے سے وفاق حکومت کے پاس کیوں گئے ہیں؟ اپنی ڈگریاں منوانے؟ سوال یہ ہے کہ وفاق اپنی ڈگریاں کیوں منوانا چاہتے ہیں؟ کیا وہ چاہتے ہیں کہ ان کے فضلاء کو معاشرے اور ریاست میں ملازمتیں ملیں؟ اگر اس کا جواب 'ہاں' میں ہے تو یہ تبدیلی خوش آئند ہے کہ مدارس ایسے افراد تیار کرنا چاہتے ہیں جو مدارس و مساجد کے علاوہ مسلم معاشرے اور ریاست کے لیے بھی مفید خدمات انجام دے سکیں۔لیکن یہ ایک بڑی تبدیلی ہے اور اس کے بہت سے تقاضے ہیں۔ مدارس کو پہلے بیٹھ کر شعوری طور پر اس تبدیلی اور اس کے تقاضوں پر غور کرنا چاہیے۔ بطور مدارس کے بہی خواہ کے ہماری طالب علمانہ رائے میں اس کا جو طریقہ مجوزہ معاہدے میں مذکور ہوا ہے کہ مدارس میٹرک اور ایف اے کے مضامین پڑھادیں تو یہ دینی مدارس اور مسلم معاشرے کے لیے نقصان دہ ہے کیونکہ:

۔ اس سے تعلیم میں موجودہ ثنویت اور دوئی مزید مستحکم ہوگی جو ایک طرح کا سیکولرزم ہے کہ درس نظامی الگ اور جدید تعلیم الگ۔ وہ اکٹھے نہیں ہوسکتے البتہ دونوں کو علی حالہ (؟) قائم رکھتے ہوئے الگ الگ پڑھایا جاسکتا ہے۔

۔ ہم جیسے لوگوں کے چیخ چیخ کر گلے بیٹھ گئے ہیں کہ موجودہ جدید یا عمومی نظام تعلیم خصوصاً اس کا نصاب مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب پر مبنی ہے اور اس کا زہر اس کے ہر ہر جزیئے میں موجود ہے لہٰذا اسے تبدیل کرنا ضروری ہے۔ دینی مدارس کو ہرگز اسے جوں کا توں قبول نہیں کرنا چاہیے اور اگر انہوں نے کرلیا تو ان کے طلبہ ہرگز اس کے بد اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ مدارس اگر اس مغرب

زدہ نظام اور اس کے نصاب کو قبول کرتے ہیں تو ہمیں کہنے دیجئے کہ یہ سادہ لوحی نہیں حماقت ہوگی۔ (حکومت اگر وفاقوں کو بورڈ تسلیم کرتی ہے تو غالباً وہ یہ بھی منوائے گی کہ اس میں سارے مضامین کے امتحان دینے کی گنجائش ہو صرف عربی اسلامیات کی نہیں)۔

۔ اوّل تو میٹرک، ایف اے (اور بی اے، ایم اے) کے حکومتی نصابات قرآن کا حرف نہیں کہ انہیں تبدیل نہ کیا جاسکے اس لیے مدارس کو اصرار کر کے انہیں تبدیل کروانا چاہیے یا اگر وہ نصاب نہیں بدلوا سکتے تو کم از کم اتنا تو ضرور ہی انہیں کرنا چاہیے کہ وہ اس نصاب کے مطابق اپنی کتابیں خود تیار کریں یا کرائیں۔ اس کی گنجائش قانون میں موجود ہے اور سیکولر لوگ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مدارس کیوں نہیں اس سے دینی مقاصد کے لیے فائدہ اٹھاتے؟

پیشکش: ہم دینی مدارس کو پیشکش کرتے ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو ہمارا ادارہ یہ کام انہیں کر کے دے سکتا ہے۔

۔ اور اگر مدارس ایف اے، بی اے اسلامیات و عربی کے ساتھ کرانا چاہیں تو اس کے لیے حکومت کے ساتھ کسی معاہدے کی ضرورت ہی نہیں کہ یہ سہولت تو پہلے سے موجود ہے۔ لیکن یہ کام نصابی وحدت کے ساتھ کرنا چاہیے اور جدید تقاضوں اور ضرورتوں کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیے نہ کہ دونوں نصابوں کو علیحدہ علیحدہ علی حالہ(؟) قائم رکھتے ہوئے۔ اس کا ایک ماڈل تو وہ ہوسکتا ہے جو ہم نے اپنے ادارے 'صفاء اسلامک سنٹر' کے لیے تیار کیا ہے۔ علماء کرام اگر چاہیں تو ہم انہیں ان کی مرضی اور ضرورت کے مطابق نئے نصابی ماڈل تیار کر کے ان کے غور و فکر کے لیے پیش کر سکتے ہیں۔ بنگلہ دیش، انڈونیشیا اور سعودی عرب میں اس کے کامیاب تجربات ہو چکے ہیں تو پاکستان میں کیوں یہ کام نہیں ہوسکتا؟

۔ دینی مدارس کے نصاب کی ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ ان کے طلبہ کو مغربی فکر و تہذیب اور اس کے علوم سے متعارف کرایا جائے جس میں ان پر اسلامی نقطۂ نظر سے نقد بھی شامل ہو۔ اس کام کی تدوین کے بعد وفاقوں کو اسے سارے مدارس میں رائج کرنا چاہیے (ہم نے اس کام کی ابتداء کر رکھی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے اکمال کی توفیق عطا فرمائی تو ہم مدارس کی خدمت میں ضرور پیش کریں گے)۔

۔ دینی مدارس کی خواہش تو یہ تھی کہ ان کی ڈگریاں حکومت تسلیم کرے لیکن مذکورہ معاہدے میں 'اتحاد

تنظیمات مدارس' نے اپنی ڈگریاں تسلیم کرانے کی بجائے حکومتی ڈگریاں منظور کر لی ہیں اور وہ بھی حکومتی مداخلت اور بالادستی کے ساتھ۔ یہ گھاٹے کا سودا ہے اور معاہدہ چونکہ ابھی تک محض اصولی ہے جس کی تفصیلات پر ابھی کام ہوگا لہٰذا ہمیں توقع ہے کہ اتحاد تنظیمات مدارس کے ذمہ داران، ان شاء اللہ، دھوکہ نہیں کھائیں گے اور یہ معاہدہ ان شاء اللہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچے گا۔

ہمیں ان لوگوں کے خدشات بھی بے جا محسوس ہوتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اتحاد کے صدر اور ناظم اعلیٰ (جناب مفتی منیب الرحمن صاحب اور مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب) حکومت کے بارے میں نرم رویہ رکھتے ہیں لہٰذا حکومت کے مطالبات مانے جاسکتے ہیں اور ایسا معاہدہ ہوسکتا ہے جو مدارس کے لیے مفید نہ ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اتحاد کی قیادت، ان شاء اللہ، زیرک لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور وہ حکومت کے کسی بھی جال اور چال میں نہیں آئیں گے، ان شاء اللہ۔

آخر میں ہم اپنی اس گزارش کو دہرائیں گے کہ دینی مدارس کے نظام تعلیم کو مزید مؤثر بنانے کی غرض سے اس میں اصلاحات کی ضرورت ہے۔ اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ ایسا ہر نظام تعلیم میں ہوتا ہے لہٰذا دینی مدارس اور وفاقوں کو چاہیے کہ وہ اس سلسلے میں ضروری اقدامات کریں۔ جو امور ان کی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ تعلیمی ثنویت کا خاتمہ اور نظام تعلیم کی وحدت
۲۔ مغربی فکر و تہذیب کا مطالعہ اور اس کا رد
۳۔ فرقہ واریت میں کمی
۴۔ نصاب پر نظر ثانی
۵۔ تربیت اساتذہ
۶۔ معیار تعلیم کو بہتر بنانا
۷۔ طلبہ کی تربیت۔۔۔ وغیرہ

غامدی مکتب فکر — علماء کرام کا ردعمل

جناب جاوید احمد غامدی صاحب اور ان کے شاگردوں کا حلقۂ فکر اگرچہ پہلے بھی موجود تھا لیکن پچھلی دہائی میں امریکہ کے پاکستان میں بڑھتے ہوئے مفادات اور ان کے ایجنٹ پاکستانی حکمرانوں نے انہیں الیکٹرانک میڈیا پر ابھرنے کا موقع دیا جس سے ان کا نقطہ نظر عام لوگوں تک پہنچا۔ وہ اپنے آپ کو حریت فکر کا پاسبان اور مجتہد سمجھتے ہیں جو عصری تقاضوں کے مطابق اسلام کی تشریح وتعبیر کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ علماء اور اسلامی دانشوروں میں غامدی صاحب کے مکتب فکر کے بارے میں تین طرح کی آراء پائی جاتی ہیں:

۱۔ اِکا دُکا افراد حسن نیت سے یا جدیدیت کے جراثیم رکھنے کی وجہ سے ان کے نقطۂ نظر سے ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کے کام کو سراہتے ہیں۔ ان میں سے بعض ان سے بحث ومباحثہ کر کے اپنے تئیں انہیں ان کی فروگزاشتوں پر متنبہ کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تاکہ وہ دین کے مرکزی دھارے (یعنی مین اسٹریم اسلام) کے قریب آجائیں۔ وہ غامدی صاحب کی آراء وافکار کو دین کی ممکن وجائز تعبیرات میں سے ایک تعبیر سمجھتے ہیں۔

۲۔ علماء اور سکالرز کی ایک بہت بڑی اکثریت انہیں گمراہ سمجھتی ہے کیونکہ وہ اجماع اور اسلاف کی تعبیر دین کو رد کرتے ہیں، قرآن کی من مانی تشریح کرتے ہیں، سنت کا استخفاف کرتے ہیں اور سرسید اور پرویز کی طرح مغربی فکر وتہذیب کے تقاضوں کے مطابق اسلام کو ڈھالنے کی سعی نامسعود کرتے ہیں لیکن ان علماء کی اکثریت غامدی صاحب اور ان کے مکتب فکر کے رد میں زیادہ فعال نہیں ہے کیونکہ انہوں نے نہ تو تفصیل سے غامدی صاحب کے لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے، نہ وہ جدید علوم میں زیادہ دسترس رکھتے ہیں اور نہ وہ ان کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اگر کبھی ان کا ٹکراؤ اور مباحثہ غامدی صاحب سے ہوجائے تو وہ کمزور پڑتے دکھائی دیتے ہیں کیونکہ غامدی صاحب بات متانت اور دلیل سے کرتے ہیں اور دلائل کی بھی ان کے پاس کمی نہیں کیونکہ انہوں نے برسوں سے اس کی تیاری کر رکھی ہے اور ان کا مطالعہ وسیع ہے جبکہ مخالفین کی زیادہ تیاری نہیں ہوتی اور وہ خود کو حق پر سمجھنے اور مخاطب کو گمراہ سمجھنے کی بناء پر جلد غصے میں آجاتے ہیں لہٰذا مباحثہ کے شرکاء پر ان کا مثبت اثر نہیں پڑتا۔

۳۔ علماء اور اسلامی سکالرز کا ایک اور گروہ غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ کو غلام احمد قادیانی کی طرح ملت کا غدار سمجھتا ہے۔ ان کی رائے میں جس طرح قادیانی نے اپنی حب جاہ و مال اور بڑا بننے کی خاطر اپنی فراست اور ہوشیاری سے اس وقت کی ورلڈ پاور اور مغربی فکر وتہذیب کی نمائندہ طاقت (تاج برطانیہ) کی اس ضرورت کو محسوس کر لیا تھا کہ انہیں برصغیر میں جہاد کے رد اور مسلمانوں کو تاج برطانیہ کا وفادار بنانے اور رکھنے کے لیے ایک دینی شخصیت اور گروہ کی ضرورت ہے تو اس نے خود کو اس کام کے لیے پیش کر دیا اور سلطنت برطانیہ کی خفیہ و اعلانیہ حمایت وقوت سے اپنی نبوت کا کاروبار چلا لیا۔ تفردات تو مولانا حمید الدین فراہی صاحب کے بھی تھے لیکن علماء نے ان کے تقویٰ و اخلاص کے پیش نظر ان سے صرف نظر کیا۔ اسی طرح مولانا امین احسن اصلاحی صاحب حجیت حدیث وغیرہ میں مستشرقین سے متاثر ضرور تھے لیکن علماء نے ان کی علمی صلابت اور اخلاص کے پیش نظر ان کے تفردات کو بھی برداشت کر لیا البتہ جاوید احمد غامدی صاحب نے غلام احمد قادیانی کی طرح اپنی ہوشیاری و فراست سے جب یہ دیکھا کہ آج کی ورلڈ پاور اور مغربی تہذیب کے غلبے کے علمبردار امریکہ اور اس کے حواریوں کو پاکستان میں ایک ایسے دینی لیڈر کی ضرورت ہے جو اسلام کو مغربی تہذیب کا چولا پہنا سکے اور مغربی فکر وتہذیب کے تقاضوں اور امریکی خواہشات کے مطابق اسلام کا ایک نیا ایڈیشن تیار کر سکے تو ان کے اندر حب جاہ و مال اور بڑا بننے کی جو خواہش تھی اس نے انہیں یہ راہ سجھائی کہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے چنانچہ انہوں نے آگے بڑھ کر یہ محاذ سنبھال لیا اور واشنگٹن کی اشیر باد اور اسلام آباد کی حمایت سے ان پر اور ان کے شاگردوں پر الیکٹرانک میڈیا کے دروازے کھل گئے، نشر و اشاعت اور ادارہ سازی کے وسائل بھی آ گئے۔ یونیورسٹیوں، بنکوں اور اسلامی نظریاتی کونسل جیسے سرکاری اداروں میں ان کے لیے جگہ نکالی گئی۔ انٹرنیٹ اور مغربی رسائل میں ذکر بھی آنے لگا۔ یوں غامدی صاحب اور ان کی فکر معروف ہوگئی۔ اس پس منظر میں علماء اور اسلامی سکالرز کا ایک گروہ سمجھتا ہے کہ غامدی صاحب محض گمراہ نہیں بلکہ وہ غلام احمد قادیانی کی طرح ملت کے غدار بھی ہیں اور مغرب اور امریکہ کے ایجنٹ کے طور پر اسلام کا ایک نیا ایڈیشن پیش کر رہے ہیں۔

یہ ایک تجزیہ تھا غامدی مکتب فکر کے بارے میں علماء کرام اور اسلامی سکالرز کے ردعمل کا۔ جہاں تک ہمارے ذاتی مؤقف کا تعلق ہے تو ہم ان شاء اللہ اگلے کسی شمارے میں اس پر اظہار خیال کریں گے۔

تعلیمی بگاڑ میں اضافے کے لیے

مرکزی حکومت کی مدہوشی

افراد اور معاشرے کے عروج و زوال اور بناؤ بگاڑ میں تعلیم اہم کردار ادا کرتی ہے۔ پاکستان جیسے ملک میں جہاں نظام حکومت فیڈرل ہے اور صوبوں کی اکائیاں مضبوط تاریخی، علاقائی، لسانی اور ثقافتی پس منظر رکھتی ہیں وہاں ان اکائیوں کو جوڑے رکھنے، باہم افہام وتفہیم بڑھانے اور طے شدہ مشترکہ قومی مقاصد کے لیے متحد رکھنے میں اہم کردار تعلیم ہی ادا کرسکتی ہے اور اسی وجہ سے تعلیم خصوصاً اس کا نصاب سازی کا ڈھانچہ مرکز کے پاس ہوتا ہے تاکہ وہ قومی یک جہتی کا سامان کرسکے۔ صوبوں کے حقوق اپنی جگہ اور وہ صوبوں کو ضرور ملنے چاہئیں لیکن جب سے ہمارے ہاں اسلام اور پاکستان دشمن بیرونی قوتوں کی درپردہ مدد سے صوبہ پرستی شروع ہوئی ہے اور 'قوم پرستی' کے نام پر مرکز گریز قوتوں نے راہ بنانی شروع کی ہے صرف یکساں نظام تعلیم ہی ایک ایسی شے ہے جسے مرکز فیڈریشن قوم کو متحد رکھنے میں استعمال کرسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۳ء کا دستور بنانے والوں نے نصاب سازی کا شعبہ مرکز کے پاس رکھا تھا اور اس کے باوجود کہ مرکزی حکومت نے اس سے شعوری طور پر زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا اور تعلیم کو اسلام، نظریۂ پاکستان اور قومی یک جہتی کے لیے کماحقہ استعمال نہیں کیا تاہم اس شعبے کے مرکز کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے کسی صوبے کو نصاب سازی اور نصابی کتب کی تیاری میں انتہا پسندی اور سیکولرزم کے فروغ کے لیے تعلیم کا ہتھیار نہیں مل سکا۔ اب جبکہ اٹھارویں ترمیم کے نتیجے میں مرکز کے اختیارات صوبوں کو منتقل کیے جارہے ہیں تعلیم اور نصاب سازی کا شعبہ بھی صوبوں کو منتقل کیے جانے کی خبریں اخبارات میں آرہی ہیں۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ وفاقی وزارت تعلیم نے رضا ربانی کمیٹی کو خط لکھا ہے کہ نصاب سازی کا شعبہ مرکز کے پاس رہنے دیا جائے اور صوبوں کو منتقل نہ کیا جائے۔

ہم عرض کرتے ہیں کہ اس بات کو ہلکا نہ لیا جائے اور اس بات کی اہمیت کو سمجھا جائے کہ نصاب سازی کا شعبہ بہر قیمت مرکز کے پاس رہنا چاہیے اور تعلیم کے اسلامی اور قومی کردار کی حفاظت کی جائے ورنہ قومی شیرازہ بکھرنے میں دیر نہ لگے گی لہٰذا نصاب سازی کا شعبہ صوبوں کو منتقل کرنے کی

غلطی ہرگز نہ کی جائے۔

تعلیمی بگاڑ میں اضافے کے لیے

پنجاب حکومت کی گرم جوشی

میاں شہباز شریف صاحب کی یہ خوبی بہرحال قابل تعریف ہے کہ وہ متحرک حکمران ہیں اور حکومت چلانے والے اہل کاروں کو بھی دوڑائے رکھتے ہیں اور غفلت کی نیند سونے نہیں دیتے اور اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ وہ تعلیم پر بہت پیسہ خرچ کر رہے ہیں لیکن نظریاتی سمت درست نہ ہونے کی وجہ سے اس بھاگ دوڑ کا نتیجہ سیکولرزم اور بیرونی ایجنڈے کے فروغ کے سوا کچھ نہیں نکلے گا اور یہی چیز قوم کے لیے مہلک ہے۔ کیا یہ قابل افسوس نہیں کہ وہ مسلم لیگ جس کے قائد نے پاکستان بنایا تھا اور یہ اعلان کیا تھا کہ پاکستان اسلام کا قلعہ ہوگا اور قیام پاکستان کے فوراً بعد انہوں نے کراچی میں تعلیمی کانفرنس بلوائی اور اس میں اعلان کیا کہ پاکستان میں تعلیم نظریاتی اور اسلامی ہوگی، اسی مسلم لیگ کا آج کا قائد پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب میں تعلیم میں سیکولرزم کو اور مغربی ایجنڈے کو فروغ دے رہا ہے۔ بیرونی ایجنڈا یہ ہے کہ پاکستان میں تعلیم کے پبلک سیکٹر کو کمزور کیا جائے کیونکہ اس میں اسلامیت اور پاکستانیت کے کچھ جراثیم پائے جاتے ہیں اور وہ سستی ہونے کی وجہ سے غریب عوام کی پہنچ میں بھی ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر نہ صرف تعلیم کو مہنگا کر رہا ہے اور یوں شرح تعلیم میں اضافے کو روک رہا ہے بلکہ اسے ویسٹرنائیز کر کے اسلامی اصولوں اور اقدار کو بھی تباہ و برباد کر رہا ہے۔ پنجاب کی حکومت یہ سب دیکھ رہی ہے اور ٹس سے مس نہیں ہو رہی۔ الٹا اس نے پنجاب کے ۱۶ بڑے کالجوں کو پرائیویٹائزیشن کی راہ پر ڈال دیا ہے جس کا نتیجہ بہرحال جلد یا بدیر پبلک سیکٹر کی کمزوری، تعلیم کی مہنگائی اور تعلیم کو سیکولر اور مغرب زدہ بنانے کی صورت میں نکلے گا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جب طلبہ اور اساتذہ اس کے خلاف احتجاج کرتے ہیں تو انہیں پولیس کی مدد سے مارا پیٹا جاتا اور سزا دی جاتی ہے۔

ہم میاں نواز شریف صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے برادر اصغر کو سمجھائیں کہ تعلیم کو پرائیویٹائز کرنے، مہنگا کرنے، اس کا اسلامی کردار کمزور کرنے اور اسے سیکولر اور مغرب زدہ بنانے کا

تمغہ اپنے سینے پر نہ سجائیں اور تعلیم کا قبلہ درست رکھیں اور کم ازکم اس کا حلیہ مزید تو نہ بگاڑیں۔

ڈاکٹر محمد امین

یامعشر الشباب! ارجعوا الی سبیل ربکم

نوجوانوں کے نام —— ایک اہم پیغام

سرمایۂ ملت

نوجوان کسی بھی قوم کا عظیم سرمایہ ہوتے ہیں چنانچہ آج کا مسلم نوجوان بھی امت مسلمہ کے لیے عظیم سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کی کوئی بھی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک نوجوانوں کی قوت اس کے ساتھ نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب اسلام کی دعوت ابتدائی مرحلے میں اور کمزور تھی تو اللہ کے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے خصوصی دعا کی کہ وہ اعلیٰ خاندانی پس منظر اور بہت سی ذاتی خوبیوں کے حامل دو نوجوانوں (عمر بن خطاب اور عمرو بن ہشام) میں سے کسی ایک کو اسلام لانے کی توفیق عطا فرمائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا قبول فرمائی اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اسلام لانے کی توفیق دی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند گھنٹے بعد جب نماز کا وقت آیا اور مسلمان دارارقم میں (چھپ کر) نماز پڑھتے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نہیں! آج سے ہم حرم کعبہ میں علی الاعلان جماعت سے نماز ادا کریں گے۔ چنانچہ مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قیادت میں صف بنا کر حرم کعبہ میں آئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کفار مکہ کے سامنے اپنے اسلام لانے کا اقرار کیا اور للکار کر کہا کہ کسی میں ہمت ہے تو ہمیں حرم میں نماز پڑھنے سے روکے۔ یوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے کفر کی کمر ٹوٹ گئی، مسلمانوں کو بہت بڑا سہارا ملا اور ان کی ہمت وحوصلے نے نئی انگڑائی لی۔

گمراہی کا خطرہ

لیکن دوسرا پہلو بھی ذرا سامنے رہے اور وہ یہ کہ دوسرا نوجوان جس میں اتنی قوت وصلاحیت تھی کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا وخواہش کا مصداق اور ہدف بنا، اس نے حق کو رد کردیا اور اس کی صلاحیتیں کفر کے غلبے اور حق کی مزاحمت میں صرف ہوئیں چنانچہ اس کی گمراہی اور کجی کی وجہ سے مسلمانوں نے اسے 'ابوجہل' یعنی جہالت کے سردار کا لقب دیا اور وہ دنیا میں بھی خاسر و ناکام ہوا، ذلت کی موت مرا

اور آخرت میں بھی اپنے کفر وظلم کی وجہ سے عتاب الٰہی کا شکار رہوگا۔

اس سے اے نوجوانانِ ملت! یہ سبق ملا کہ جوانی اگرچہ قوت کا منبع ہوتی ہے اور صلاحیتیں اس میں عروج پر ہوتی ہیں لیکن یہ قوت صحیح راہ میں بھی استعمال ہوسکتی ہے اور غلط راہ میں بھی۔ اس لیے مسلم نوجوان کو چاہیے کہ وہ:

۔ ہمیشہ اس کا استحضار رکھے کہ یہ جوانی اور یہ صحت، قوت اور صلاحیت محض اللہ کی دین ہے اور اس کی شخصی محنت اور کوشش کا اس میں کوئی دخل نہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو اسے بیمار و معذور بھی کرسکتا تھا یا جوانی سے پہلے دوسرے عالم بھی روانہ کرسکتا تھا۔

۔ اس لیے اس کا فیصلہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اس اللہ کا بندہ بنے گا جس نے اسے یہ جوانی اور قوت وصلاحیت عطا کی ہے اور وہ اپنی قوتوں کو اللہ کی راہ میں اور اس کی مرضی کے کاموں میں صرف کرے گا اور زندگی اس کے احکام کے مطابق گزارے گا۔

۔ وہ اپنی پوری شعوری قوت سے برائی کا راستہ ترک کرے گا، معصیت اور اللہ کی نافرمانی سے بچے گا اور اپنی جوانی اور قوت وصلاحیت کو اچھے اور تعمیری کاموں میں صرف کرے گا اور نیکی کی قوتوں کا ساتھ دے گا۔

۔ اور نیکی پر چلنے اور برائی سے بچنے کی توفیق بھی اللہ ہی سے طلب کرے گا کیونکہ اس کی مرضی کے بغیر اس کائنات میں درخت کا ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔

مقصدِ زندگی

ایک بات جو شروع ہی سے ہر مسلم نوجوان کے ذہن میں واضح ہوجانی چاہیے وہ یہ ہے کہ اسے اپنے مقصدِ زندگی کا ادراک ہونا چاہیے۔ اس بات کو اگر ہم فلسفیانہ سطح پر لینے کی بجائے سادہ اور عملی انداز میں لیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک مسلمان کی زندگی کی آخری غایت یہ ہوتی ہے کہ اس کا اللہ اس سے راضی ہوجائے اور اس کی خوشنودی اسے حاصل ہوجائے اور اللہ کی رضا کے حصول کا طریقہ ہے دنیا میں اللہ کی عبادت و اطاعت۔ قرآن نے اس کے لیے ایک ہی لفظ عبودیت استعمال کیا ہے جو ان دونوں باتوں کا جامع ہے۔

عبودیت کیا ہے؟ انسان کا یہ احساس کہ وہ اللہ کا عبد ہے۔ یہ احساس چونکہ بندگی کی جان ہے اور انسان کی ہدایت کا اسی پر انحصار ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال مہربانی سے اسے انسان کی فطرت

میں رکھ دیا ہے۔ (آج کی زبان میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ انسان کی جین(gene) میں موجود ہے اور اس کے سٹرکچر میں(built in) ہے لہٰذا اللہ کو ماننا اور اس سے محبت کرنا انسان کی فطرت ہے او رہمارا دنیا کا تجربہ یہ ہے کہ ہم جس سے محبت کرتے ہیں وہ ہمیں بہت خوبصورت لگتا ہے۔ ہم اس کے گھر کے چکر لگاتے ہیں (طواف کعبہ) اور اس کے گھر کی دیواروں سے لپٹتے (ملتزم) اور انہیں چومتے ہیں (حجرِ اسود)۔ اسے کبھی بھولتے نہیں ہر وقت اٹھتے، بیٹھتے، لیٹے، کام کرتے اسے یاد رکھتے ہیں (ذکر)۔ اس کی کبریائی کا اقرار کرتے اور اس کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں، اس کے آگے جھکتے ہیں بلکہ اس کے سامنے ماتھا ٹیک دیتے ہیں (نماز)۔ اس کی مخلوق سے بھی محبت کرتے ہیں اور اس کا دیا ہوا مال ان پر خرچ کرتے ہیں تا کہ ان کی ضرورتیں پوری ہوجائیں (زکوٰۃ) اور اس کی محبت و اطاعت میں ہمیں کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہتا (روزہ)۔ اسلام میں عبادت کی یہی چار شکلیں ہیں نماز (بشمول ذکر)، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔

اور یہی نہیں دنیا میں ہمارا مشاہدہ اور تجربہ یہی ہے کہ ہمارا محبوب ہم سے جو کہے ہم وہ خوشی خوشی کرتے ہیں اور جس سے منع کرے اس سے رک جاتے ہیں بلکہ ہم تو اس کی محبت کی ایک نظر کے منتظر رہتے ہیں کہ وہ ہم سے کچھ کہے تو سہی۔ وہ مطالبہ نہ بھی کرے تو ہم یہ جاننے کی فکر میں رہتے ہیں کہ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے تا کہ ہم وہ کریں اور کون سی باتیں اسے اچھی نہیں لگتیں تا کہ ہم ان سے باز رہیں۔ بلکہ ہم وہی کھاتے ہیں جو اسے اچھا لگے، ہم وہی پہنتے ہیں جو اسے بھلا معلوم ہو اور یہی ہے دنیا میں اللہ کی اطاعت کی اساس اور طریقہ کہ ہم دنیا میں وہ سارے کام کریں جو اللہ کو پسند ہیں، جن کا وہ حکم دیتا ہے (اوامر) اور ان سارے کاموں سے ہم رک جائیں جو اسے ناپسند ہیں اور جن سے وہ روکتا ہے (نواہی)۔

پس خلاصہ یہ کہ ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد ہے اللہ کی رضا اور خوشنودی کا حصول اور اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ دنیا کی زندگی اللہ کی عبادت اور اطاعت کرتے ہوئے گزاری جائے۔

تعلیم وتربیت کی عمر

تعلیم کیا ہے؟ یہ جاننے کی خواہش وکوشش کہ ہمارا اللہ ہمارا محبوب ہم سے کیا چاہتا ہے؟ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے (تا کہ ہم وہ کریں) اور کن باتوں سے وہ ناراض ہوتا ہے (تا کہ ہم وہ نہ کریں)؛ اور تربیت کیا ہے؟ ہم عملاً ایسے بن جائیں جیسے اللہ ہمیں دیکھنا چاہتا ہے۔

ہمارے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوجائے اور ہمیں رغبت اور شوق سے ان کاموں کی عادت پڑ جائے جن سے وہ خوش ہوتا ہے اور ان کاموں سے ہم رک جائیں جو اسے پسند نہیں۔

نوجوانوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ان کی تعلیم و تربیت کی عمر ہے لہٰذا فی الوقت انہیں اپنی ساری قوتیں اور صلاحیتیں صرف اسی کام پر لگانی چاہئیں تاکہ مستقبل میں جو وہ بننا چاہتے ہیں بن سکیں اور جو کرنا چاہتے ہیں اس کی صلاحیت اور مہارت ان کے اندر پیدا ہوجائے۔ ہم نے سوچ کر عملاً دو لفظ استعمال کیے ہیں ایک تعلیم اور دوسرے تربیت۔ تعلیم سے مراد ہے علم حاصل کرنا اور تربیت سے مراد ہے اس علم کے مطابق اپنی شخصیت کو ڈھالنا۔ اس تعریف سے ظاہر ہے کہ یہ دونوں باہم مربوط ہیں لیکن ان کے تقاضے الگ الگ بھی ہیں جیسا کہ ہم آگے ذکر کریں گے۔

تعلیم اور اس کے مسائل

مسلم نوجوانوں کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ وہ نظام تعلیم جو ہمارے معاشرے اور ملک میں مروج اور میسر ہے وہ بڑی حد تک ناقص اور غیر تسلی بخش ہے۔ نظری لحاظ سے اس میں تین بڑے نقائص اور خامیاں ہیں:

۱۔ یہ اسلامی تعلیمات اور اس کے تقاضوں کے مطابق نہیں

۲۔ یہ مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب پر مبنی ہے

۳۔ اس میں اسلامی تربیت اور کردار سازی کا اہتمام نہیں

عملی لحاظ سے اس کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ ثنویت اور دوئی پر مبنی ہے یعنی اس میں دینی اور دنیوی تعلیم کا نظام الگ الگ ہے۔ عمومی یا جدید تعلیم جو سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جاتی ہے اس میں مؤثر دینی تعلیم و تربیت موجود نہیں اور دینی تعلیم (جو مدارس میں دی جاتی ہے) وہ معاشرے کی عصری ضرورتوں اور تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں اور دنیوی علوم کی تدریس اس میں شامل ہی نہیں۔ یوں یہ دونوں اپنی اپنی جگہ ناقص ہیں۔

آج کے نوجوانوں کی بہت بڑی اکثریت چونکہ جدید تعلیم کے اداروں میں پڑھتی ہے جہاں مؤثر دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام موجود نہیں لہٰذا نوجوانوں کو ان کے حصول کی بہت فکر کرنی چاہیے اور قرآن و حدیث، عربی زبان اور دیگر اسلامی علوم جاننے کے لیے اپنے طور پر الگ سے جدوجہد کرنی چاہیے۔ الحمدللہ! ہمارے معاشرے میں ایسے افراد اور ادارے موجود ہیں جن سے انہیں اس ضمن میں مدد مل

سکتی ہے لیکن اس کا باقاعدہ نظام چونکہ کہیں موجود نہیں اس لیے نوجوانوں کو خود ہی ذاتی دلچسپی لے کر یہ کام کرنا پڑے گا اور یہ کام انہیں ضرور ہی کرنا چاہیے۔ اس کا ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوگا کہ جس دنیاوی یا جدید علم کے شعبے میں آگے جا کر وہ تخصص حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ اس کا مطالعہ قرآن وسنت کی روشنی میں بھی کر سکیں گے۔

تربیت وتزکیہ

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا تربیت سے مراد ہے اپنی شخصیت کو حاصل کردہ علم کے مطابق عملاً ڈھال لینا۔ قرآن حکیم اس کے لیے تزکیہ کی اصطلاح استعمال کرتا ہے یعنی اپنے نفس کو غلط رویوں سے بچانا اور اسے صحیح رویوں کا عادی بنانا۔ اسے عام زبان میں تعمیر شخصیت، تعمیر سیرت یا کردار سازی بھی کہتے ہیں۔ یہاں یہ بنیادی حقیقت ذہن میں رہے کہ انسان کی تعمیر شخصیت میں جو چیز بنیادی کردار ادا کرتی ہے وہ اس کا عقیدہ یا ورلڈ ویو ہے یعنی اس کا تصور الہ، تصور انسان اور تصور کائنات۔ اگر اس کا ایمان اور عقیدہ یہ ہے کہ اُس سمیت اِس کائنات کا خالق و مالک اور اسے چلانے والا ایک اللہ ہے اور وہ اس کا حقیر عبد ہے تو اس دنیا میں زندگی گزارنے کے چھوٹے بڑے ہر معاملے میں اسے اللہ کی اس ہدایت پر عمل کرنا چاہیے جو اس نے قرآن اور سنت پیغمبرؐ کی صورت میں اسے عطا کی ہے۔ اگر وہ جانتا ہے کہ یہ دنیا عارضی ہے اور مستقل اور پائیدار زندگی آئندہ آنے والی ہے جس میں دنیا میں اس کے کیے گئے اعمال کا نتیجہ نکلے گا تو اسے دنیا کی زندگی اس طرح گزارنی چاہیے جس طرح اس کا خالق و مالک اللہ چاہتا ہے تاکہ وہ آخرت میں اس سے راضی ہوجائے اور اپنے انعامات (جنت) اور خوشنودی سے اسے نوازے۔ یہ چیز ہے جو انسان کے رویوں اور عادتوں پر اثر انداز ہوتی ہے بلکہ ان کی تشکیل کرتی ہے مثلاً اللہ نے کہا ہے سچ بولو تو اسے سچ بولنا ہے۔ اللہ نے کہا ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرو تو اس نے ظلم نہیں کرنا۔ اللہ نے کہا میرے سامنے پانچ وقت جھکو تو اس نے جھکنا ہے۔ اللہ نے کہا غریبوں کی مدد کرو تو اس نے کرنی ہے۔ غرض عملی زندگی میں انسان کے رویے اور اس کی عادتیں ایسی ہی بنتی چلی جاتی ہیں جیسے کہ اس کے عقیدے، علم اور تعلیم کا تقاضا اور مطالبہ ہوتا ہے۔

مسلم ماہرین تربیت وتزکیہ نے پچھلے چودہ سال میں جو تحقیق اور تجربے اس ضمن میں کیے ہیں، ان کی بناء پر ان کا کہنا ہے کہ تربیت میں عملاً سب سے زیادہ کردار دو چیزیں ادا کرتی ہیں ایک استحضار عبدیت اور دوسرے اچھی صحبت۔ استحضار عبدیت سے مراد یہ ہے کہ یہ بات ہر وقت انسان

کے ذہن میں تازہ رہے اور بھول نہ جائے کہ ہم اللہ کے عبد ہیں اور وہ ہمارا خالق و مالک اور ہادی ہے اور ہمیں یہی زیبا ہے کہ ہم اس کی عبادت و اطاعت کرتے رہیں۔ اس استحضار عبودیت کے لیے وہ قرآنی اصطلاح 'ذکر' استعمال کرتے ہیں۔ ذکر کا لفظی مطلب ہے یاد کرنا، یاد رکھنا اور بھول نہ جانا۔ اصطلاحاً اس سے مراد ہے ذکر اللہ یعنی اللہ کے خالق و مالک اور معبود و مطاع ہونے کو اور اپنے عبد اور مطیع و فرماں بردار ہونے کو یاد رکھنا اور اسے بھول نہ جانا۔اس کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اٹھتے، بیٹھتے، چلتے، لیٹے اور کام کرتے غرض ہر وقت اور ہر حالت میں اللہ کو اور اس کی کبریائی اور عظمت کو اور اپنی محتاجی، کمزوری اور خامیوں کو یاد رکھے چنانچہ وہ کہے **سبحان اللہ** (اے اللہ تو پاک ہے ہر کمزوری اور نقص سے اور میں کمزور اور خطار کار ہوں)، **اللہ اکبر** (اے اللہ! تو سب سے بڑا اور عظیم ہے اور میں تیرے مقابلے میں حقیر اور کمتر ہوں)، **الحمدللہ** (اے اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے بندگی کا ادراک عطا فرمایا اور مجھے ہر قسم کی نعمتیں دیں)۔کبھی وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے (استغفار کرنا) اور کبھی اس پیغمبر کے لیے اللہ کی رحمت کا طلب گار ہوتا ہے جو اس کی ہدایت کا سبب بنا (درود شریف پڑھنا)۔

تربیت کا دوسرا بنیادی اصول اچھی صحبت ہے۔ اچھی صحبت کا مطلب ہے اپنا وقت ان لوگوں کے ساتھ گزارنا جنہیں اپنی عبدیت کا استحضار ہو اور جو اللہ کی عبادت اور اطاعت کے راستے پر چلنے والے ہوں۔ گھر کا ماحول اور والدین، بہن بھائی اور اہل خاندان کے ساتھ وقت گزارنا بھی ایک طرح کی صحبت ہے لہٰذا گھر کا ماحول اسلامی ہونا چاہیے یعنی ایسا جو استحضار عبدیت میں مدد دے اور جہاں لوگ اللہ کی محبت اور عبادت اور اطاعت کرنے والے ہوں۔ صحبت کا دوسرا اظہار آپ کے دوستوں سے ہوتا ہے کہ آپ گلی محلے میں اور سکول کالج میں دوستی کن لوگوں سے کرتے ہیں۔ اگر آپ اچھے اور نیک لوگوں سے دوستی کریں گے تو آپ پر اس کے اچھے اثرات پڑیں گے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ دوستوں کے انتخاب میں محتاط رہو اور صرف نیک لوگوں سے دوستی رکھو۔ صحبت کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ اگر آپ عبودیت کے راستے پر چلنے میں مشکل محسوس کریں اور کوشش کے باوجود خود پر قابو نہ پا سکیں اور اللہ کی نافرمانی سے بچ نہ سکیں تو آپ کسی ایسے نیک اور صالح آدمی کی صحبت اختیار کریں، اس سے بار بار ملیں، اس کی مجلس میں بیٹھیں، ہو سکے تو کچھ ہفتے یا مہینے اس کے پاس جا کر رہیں تاکہ اس کی مدد اور صحبت سے آپ پر بھی نیکی کا رنگ چڑھ جائے، آپ اللہ کی معصیت سے بچ

جائیں اور اللہ کی بندگی کی راہ پر چلنا آپ کے لیے آسان ہو جائے۔ ایسے موزوں لوگ (جنہیں عرف عام میں مرشد، مربی یا پیر کہا جاتا ہے) اگرچہ بہت کم ہیں اور امت کے زوال اور ہر شعبے میں بگاڑ کی وجہ سے اس شعبے میں بھی زوال آیا ہے اور اکثر صوفی، پیر اور سجادہ نشین محض دنیا دار بلکہ دین فروش ہیں لیکن اللہ کی دنیا نیک بندوں سے بہرحال بالکل ہی خالی نہیں ہوئی اور اصلاح کے سچے طلب گاروں کو کوئی نہ کوئی مخلص اور نیک بندہ ڈھونڈنے سے مل ہی جاتا ہے جو اللہ کے راستے پر چلنے میں ان کی مدد کرتا ہے۔

یہ تھیں تعلیم و تربیت سے متعلق وہ چند ضروری باتیں جن پر عمل کر کے آج کا مسلم نوجوان اللہ کی عبادت اور اطاعت کی زندگی گزار سکتا ہے۔

دینی و سیاسی جماعتوں سے تعلق میں اعتدال کی ضرورت

نوجوانوں کی قوتوں اور صلاحیتوں کے پیش نظر اور اس وجہ سے کہ انہوں نے ہی آگے جا کر معاشرے کا رکن بننا اور اہم کردار ادا کرنا ہوتا ہے تقریباً ساری ہی دینی و سیاسی جماعتیں یہ کوشش کرتی ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچ لیں اور انہیں اپنے حلقے اور دائرے میں لے آئیں تاکہ مستقبل میں وہ ان کے لیے سرمایہ ثابت ہو سکیں۔ اس کے لیے تقریباً ہر جماعت اور تنظیم نے طلبہ اور نوجوانوں کے ونگ بنا رکھے ہیں۔

ایک معقول حد کے اندر رہتے ہوئے اور متوازن انداز میں کسی دینی، دینی سیاسی یا سیاسی تنظیم یا جماعت کے ساتھ وابستگی کوئی عیب کی بات نہیں لیکن یہ عمر ایسی ہوتی ہے جس میں جذبات کو عقل و خرد پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ دوسری طرف جماعتوں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ طلبہ اور نوجوانوں کا زیادہ سے زیادہ وقت اور صلاحیتیں لے سکیں اس لیے طلبہ اور نوجوانوں کے لیے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ تنظیموں اور جماعتوں سے وابستگی میں وہ مندرجہ ذیل حدود و قیود کا خیال رکھیں:

۱۔ چونکہ یہ عمر تعلیم و تعلم کی ہوتی ہے اور اسی پر نوجوانوں کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے اس لیے کسی طالب علم/نوجوان کو اپنا اتنا وقت اور صلاحیتیں کسی تنظیم اور جماعت کو نہیں دینی چاہئیں جس سے اس کی تعلیم کا حرج ہو۔

۲۔ سیاسی جماعتوں کے لیے کام کرنے کے سلسلے میں محتاط رہیں کیونکہ ہماری اکثر سیاسی جماعتیں نظریاتی کم اور افراد و خاندانوں کے گرد زیادہ گھومتی ہیں اور انہی کے مفادات کا خیال رکھتی ہیں۔ وہ

اکثر سیکولر ہیں اور ان میں دین اور دینی مفادات کا لحاظ بھی برائے نام ہوتا ہے۔

۳۔ ہماری دینی اور دینی سیاسی جماعتوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اسلام کی ایک خاص تعبیر اور ایک خاص مسلک پر قائم ہے لیکن دعوی ہر ایک کا یہی ہے کہ وہ پورے اسلام کی نمائندہ ہے اور صرف اس کا مسلک اور نظریہ ہی صحیح اسلام ہے اور باقی لوگ غلط اور گمراہ ہیں۔ ظاہر ہے یہ درست رویہ نہیں ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ اگر آپ اسلام کی کسی ایک خاص تعبیر یا مسلک کو صحیح سمجھتے ہیں تو یہ کوئی بری بات نہیں۔ آپ ایسا سمجھتے رہیں لیکن آپ اپنی تعبیر دین اور مسلک کو پورا دین اور دین کی واحد صحیح تعبیر اور مسلک نہ سمجھیں بلکہ دوسرے مسالک اور نقطہ ہائے نظر میں بھی صحت کا امکان تسلیم کریں (جیسا کہ اجتہادی امور میں اہل علم کا طریقہ ہے) اور دوسرے مسالک کے ماننے والوں کو بھی اپنا اسلامی بھائی سمجھیں اور قوم کو مسلکوں اور فرقوں میں تقسیم نہ کریں بلکہ خود کو مسلم کہیں اور پورے معاشرے کو مسلم معاشرہ اور امت کو امت مسلمہ سمجھیں۔

طرز زندگی/ لائف اسٹائل

اب ہم ان مسلم نوجوانوں کے لیے کچھ رہنما خطوط کا ذکر کرتے ہیں جو اسلامی زندگی گزارنا چاہتے ہیں تا کہ وہ جان لیں کہ ان کی عملی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیے۔

ا۔ ہر مسلم نوجوان کے دل میں یہ تڑپ ہونی چاہیے کہ وہ ایسی زندگی گزارے جو اس کے رب کو پسند ہو۔ اس کے دل میں گناہ سے نفرت ہو اور وہ معصیت اور نافرمانی سے دور رہے۔ اسے صرف دنیا بنانے اور اس میں آگے بڑھنے کی فکر نہ ہو بلکہ آخرت بنانے اور اس میں اعلیٰ درجات کے حصول کی بھی فکر ہو۔ نوجوانی میں اطاعت کی زندگی گزارنا بڑے نصیب کی بات ہے اور اللہ سے اس کی توفیق طلب کرتے رہنا چاہیے۔ بقول سعدی شیرازی ؎

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری
وقت پیری گرگ ظالم مے شود پرہیز گار

یعنی جوانی میں توبہ کرنا شیوۂ پیغمبری ہے جبکہ بڑھاپے میں تو ظالم بھیڑیا بھی نیک بن جاتا ہے

۲۔ ہر نوجوان کو چاہیے کہ وہ ہرگز فارغ نہ بیٹھے بلکہ اپنے آپ کو مصروف رکھے اور نہ صرف مصروف رکھے بلکہ تعمیری کاموں میں مصروف رکھے کیوں کہ خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے جب کہ مومن کو ہر لحظہ شیطان اور نفس کے شر سے پناہ مانگنی چاہیے۔ اس کا بہترین حل یہ ہے کہ اپنے اوقات کو منضبط کیا

جائے، چوبیس گھنٹوں کے لیے ٹائم ٹیبل بنالیا جائے اور حتی المقدور اس پر سختی سے کاربند ہوا جائے۔

اگرچہ تعمیری سرگرمیاں بہت سی ہیں جن میں سے کچھ کا ہر نوجوان کو اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق انتخاب کرلینا چاہیے لیکن ہم انہیں ایک ایسی سرگرمی کی طرف لانا چاہتے ہیں جو ہمیشہ ان کے کام آئے گی اور وہ ہے مطالعہ کی عادت۔ اس سے مراد عمومی مطالعہ ہے نہ کہ سکول وکالج کی روٹین کی پڑھائی۔ ہر نوجوان کو چاہیے کہ وہ مطالعہ کی عادت ڈالے اور اپنی سہولت سے دن رات کا کوئی حصہ اس کے لیے ضرور متعین کرے۔

کیریئر پلاننگ

اوپر ہم نے مقصد زندگی کا ذکر کیا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دنیا میں خواہ جس شعبہ زندگی میں بھی کام کرے، آخرت اسے نہیں بھولنی چاہیے اور اسے اپنی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزارنی چاہیے لیکن اس کا یہ سطلب ہرگز نہیں ہے کہ آدمی دنیا میں جو کچھ کرنا اور بننا چاہتا ہے اس کی پلاننگ نہ کرے اور اس کے لیے جدوجہد نہ کرے بلکہ ہر نوجوان کو دستیاب مالی وسائل اور اپنے ذوق، رجحان اور صلاحیتوں کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ زندگی میں کون سی لائن اختیار کرے گا، استاد بنے گا یا انجینئر، ڈاکٹر بنے گا یا تاجر۔۔۔وغیرہ۔

ایک عمومی اصول یہ ہے کہ ہرفن مولا (jack of all trades) بننے کی بجائے کسی ایک شعبے میں تخصص (specialization) حاصل کرنا چاہیے اور اس میں کمال (excellence) حاصل کرنے کو ہدف بنانا چاہیے یعنی کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی۔ لہٰذا آگے بڑھنے، فرسٹ آنے اور کمال حاصل کرنے کی جستجو اور خواہش ہر مسلم نوجوان کے دل میں ہونی چاہیے اور اسے نالائق اور کمزور رہنے کو قبول نہیں کرنا چاہیے؛ بقول اقبال ؎

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

آدمی کو اپنی صلاحیتوں کو نمو دینے کی فکر کرنی چاہیے کہ باصلاحیت اور اولوالعزم آدمی جہاں جائے گا کامیاب ہوگا۔اسی بناء پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا تھا کہ تم میں سے جو لوگ دور جاہلیت میں آگے تھے وہ اسلام میں بھی آگے ہیں اور اگر کوئی غیر مسلم حکمران اسلام قبول کرلیتا تو آپ عموماً اسے عہدے پر برقرار رکھتے تھے اور تبدیل نہ فرماتے تھے اور حضرت عمرؓ کی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ

سے ہی آپ ﷺ نے ان کے قبول اسلام کے لیے دعا کی تھی۔ تو خلاصہ یہ کہ اپنی صلاحیتوں کو نکھارنا اور کسی شعبے میں کمال حاصل کرنا ہر نوجوان کا ہدف ہونا چاہیے۔ اگر اسے ڈاکٹر بننا ہے تو صرف ڈاکٹر نہیں بننا بلکہ بہترین اور اعلیٰ پائے کا ڈاکٹر بننا ہے۔ استاد بننا ہے تو صرف استاد نہیں بننا بلکہ بہترین اور اعلیٰ درجے کا استاد بننا ہے۔

کھیل اور تفریح

نوجوانوں سے یہ توقع رکھنا بے جا ہے کہ وہ بڑے بوڑھوں کی طرح سنجیدہ ہوجائیں۔ بلاشبہ شرارتیں، تفریح اور کھیل کود نوجوانوں کی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں اور ان میں کوئی حرج اور عیب کی بات بھی نہیں لیکن اس ضمن میں کچھ باتوں کا لحاظ ضروری ہے:

۔شرارتیں اور مذاق ایسا نہیں ہونا چاہیے جس سے کسی کو دکھ اور تکلیف پہنچے اور اس کے حقوق ضائع ہوں۔

۔ مشغلے اور تفریح تعمیری ہونی چاہیے یعنی تفریح بھی ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ تعمیری بھی ہو۔ مطلب یہ کہ اس کے کچھ فائدے بھی ہوں محض وقت گزاری نہ ہو بلکہ ہمیں کہنے دیجیے کہ وقت گزاری (time killing) کا تصور غیر اسلامی ہے کیونکہ یہ وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے جبکہ مومن کو تو آخرت میں ایک ایک لمحے کا حساب دینا ہے۔ بے مقصدیت اور بوریت کا احساس اسی وقت ہوتا ہے جب آدمی کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو اور آدمی تعمیری طور پر مصروف نہ ہو۔

۔کھیلوں میں مشغولیت بھی بری اور غیر تعمیری نہیں جب تک کہ ایک حد کے اندر رہے۔ مطلب یہ کہ کھیل اور تفریح اور اچھا کھانا اور پہننا (اور اسلامی حدود کے اندر فیشن) زندگی کا ایک حصہ ہے لیکن اسے زندگی کا ایک حصہ ہی رہنا چاہیے نہ کہ پوری زندگی اور اس کا واحد مقصد؛ جیسا کہ فارسی کے ایک محاورے کا ترجمہ ہے کہ کھانا پینا اور کھیل کود برائے زندگی نہ کہ زندگی برائے کھیل کود وتفریح۔

صنف مخالف سے روابط

عورت اور مرد کے تعلقات کا صحیح خطوط پر استوار ہونا صالح معاشرت اور تہذیب کی جان ہوا کرتا ہے اور قوموں کے عروج وزوال میں اس کا اہم کردار ہوتا ہے۔ اسلام نے اس بارے میں اپنے متبعین کو تفصیلی رہنمائی دی ہے اور مسلم معاشرے میں لوگ صدیوں تک اسلام کے سنہری معاشرتی اصولوں پر عمل کر کے پر امن اور خوشگوار زندگی گزارتے آئے ہیں لیکن مغربی تہذیب نے خدا کی رہنمائی کو مسترد کر کے اور معاشرت کو انسانوں کی خواہشوں اور ہویٰ وہوس کے حوالے کر کے نہ صرف

اپنا معاشرہ تباہ کیا ہے بلکہ اب وہ اپنی عریانی، فحاشی اور بے حیائی بلکہ کہنا چاہیے کہ اپنی بے سکونی، اضطراب اور بے چینی کو مسلم معاشرے کو برآمد کرنے پر بھی مصر ہے اور ہمارے ہاں کے مغربی تہذیب سے مرعوب اذہان وقلوب اس کو خوش آمدید بھی کہہ رہے ہیں اور اپنی زندگی میں دکھوں او ر بے سکونی کو راہ دے رہے ہیں۔

اسلام نے عورت اور مرد کا دائرہ کار الگ الگ رکھا ہے۔ اس نے عورت کو گھر ہستی، بچوں کی تربیت اور مرد کو سکون وتعاون مہیا کرنے کی خاطر اسے گھر میں رہنے کی ہدایت کی اور مرد کو کمانے اور گھر سے باہر تگ ودو کی راہ دکھائی اور عورت کو ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے روپ میں عزت واحترام کا مقام دیا اور اس کے حقوق (وفرائض) کا تعین کردیا۔ اس کے مقابلے میں مغربی تہذیب نے عورت اور مرد کی مساوات کا نعرہ لگا کر عورت کو شمع محفل بنادیا اور اسے گھر سے نکال کر بازار میں لے آئی۔ شرم وحیا، لباس وستر اور نکاح کا تصور غارت کردیا اور فرد کی لامحدود آزادی کے نعرے اور نتیجے میں انسان اور حیوان میں فرق مٹ گیا اور آزادانہ جنسی تعلق بلکہ جنسی بے راہ روی کو بھی قانونی تحفظ حاصل ہوگیا۔

اب مغرب جو مصیبتیں ہمیں برآمد کررہا ہے اس میں ایک تو ٹی وی اور موبائل فون کی بیماری ہے (مغرب صرف ٹیکنالوجی نہیں بیچتا بلکہ اس کے پروگرام اور اقدار بھی ساتھ بھجواتا ہے) اور دوسرے مخلوط تعلیم اور مخلوط معاشرت۔ اب اگر ایک یونیورسٹی میں نوجوان لڑکا اور لڑکی اکٹھے پڑھیں گے اور ان پر پابندیاں بھی نہیں ہوں گی تو اخلاق تو بگڑیں گے۔ اسلام تو عورتوں اور مردوں کو غض بصر کا حکم دیتا ہے یعنی وہ نظر بھر کر ایک دوسرے کو دیکھیں بھی نہیں جبکہ مغربی تہذیب میں تو عورتوں مردوں کا اختلاط اور وڈیو اور سینما اور میوزک اور ڈانس وغیرہ معمول کی سرگرمیاں ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مسلم سوسائٹی کو مغربی معاشرت اور اس کی معاشرتی اقدار کو، جو صراحتاً غیر اسلامی ہیں، خوب سوچ سمجھ کر رد کردینا چاہیے اور ہر مسلم لڑکے اور لڑکی کو موجودہ غیر اسلامی اور فساد زدہ ماحول میں اپنے اخلاق کی حفاظت کی سخت فکر کرنی چاہیے اور اخلاقی فساد میں مبتلا ہونے سے بچنے کی بھرپور جدوجہد کرنی چاہیے اور اس میں اللہ کی نصرت بھی طلب کرتے رہنا چاہیے۔

حرف آخر

ہماری رائے میں یہ وہ لائحہ عمل ہے جو ہر مسلم نوجوان طالب علم (لڑکے اور لڑکی) کو اختیار کرنا چاہیے تاہم سطور بالا میں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اور جو مؤقف اختیار کیا ہے، اس کے بارے میں

اگر کسی نوجوان کو شرح صدر نہ ہو یا اس کے ذہن میں اس حوالے سے سوالات پیدا ہوں تو ہمیں اس سے مکالمہ کر کے، اس کے سوالوں کا جواب دے کر اور اس کی تشفی کر کے خوشی ہوگی۔ نوجوان خط، فون، ای میل، ملاقات جس طرح بھی چاہیں ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں، ہم انہیں خوش آمدید کہیں گے۔(رابطے کے لیے ضروری معلومات البرہان کے پہلے صفحے پر موجود ہیں)

تفہیم مغرب مولانا نور عالم

امریکہ اسلام دشمن کیوں ہے؟

دہشت گردی کے خلاف جنگ، درحقیقت اسلام کے خلاف جنگ ہے۔ اس میں کسی طرح کا شبہ خود فریبی وحماقت کے ساتھ ساتھ حالات و واقعات سے بالکلیہ بے خبری اور سچائیوں سے بالقصد آنکھیں موند لینے کے مترادف ہے۔ امریکہ اسلام کے خلاف یہ جنگ درحقیقت یہود کی طرف سے، یہودیوں کی خاطر، اپنے بے پایاں خرچ سے، اپنے فرزندوں کی قربانی، اپنی عالم گیر بدنامی اور مسلمانوں اور عربوں کی دوررس اور دیرپا بلکہ نہ ختم ہونے والی ناگزیر دشمنی مول لے کر لڑ رہا ہے۔لیکن وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ آئندہ سطور میں اس حیران کن سوال کا مختصر مگر تشفی بخش جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

جو لوگ یہودیوں کی بازی گری، دنیا پر اپنے تسلط کے لیے فریب کاری اور انسانی لہو کو پانی سے زیادہ ارزاں بنا ڈالنے کی اُن کی 'فن کاری' نیز عصر حاضر میں امریکہ پر اُن کی واقعی اور ہمہ گیر حکمرانی کی حقیقت سے واقف ہیں، ان کی لیے مذکور الصدر سچائی چنداں تعجب کی بات نہیں، لیکن بے خبروں کے لیے عموماً اور فریب خوردہ وفریب دہندہ مسلم اور عرب حکمرانوں کے لیے خصوصاً یہ سچائی 'ہرزہ سرائی' سے زیادہ کچھ نہیں، جو بقول ان کے 'بنیاد پرست' و'انتہا پسند' اہل قلم اور مفکرین ہمیشہ کیا کرتے ہیں اور اپنے سادہ لوح قارئین ومعتقدین میں پھیلایا کرتے ہیں۔

امریکہ میں مصیبت کی جڑ 'صہیونی مسیحیت' ہے جس نے 'صہیونی یہودیت' کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔صہیونی یہودیوں نے (جن کے ہاتھ امریکی معیشت و دولت وثروت اور ذرائع ابلاغ کی کلید ہے اور جو امریکہ پر اس درجہ تسلط رکھتے ہیں کہ سارے صدور اور حکمراں خواہی نہ خواہی اُن کی مرضی

سے انحراف کرنے کی جرأت نہیں کر پاتے) امریکی مسیحیوں کی معتد بہ تعداد کو شیشے میں اتار کر انہیں صہیونیت گزیدہ بنا دیا ہے۔ انہیں اپنے اِن خرافی عقیدوں پر ایمان لانے پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ اور مسیحی دونوں حقیقی بھائی ہیں، دونوں اللہ کی چیدہ پسندیدہ قوم ہیں، دونوں کو اللہ نے زمین پر اپنی مشیت کو برپا کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ لہٰذا دونوں سارے افرادِ بشر سے اعلیٰ و ارفع ہیں۔ دیگر فرزندانِ آدم ان کے نزدیک کسی شمار و قطار میں نہیں ہیں۔ اس لیے یہ دونوں مشیتِ الٰہی کو بروئے کار لانے کے لیے انہیں دھوکہ دینے، ان کا استحصال کرنے، ان کے ساتھ ہر طرح کی تذلیل، تحقیر، تمسخر اور قتل و غارت گری کا معاملہ کرنے کا ہمہ گیر جواز رکھتے ہیں۔ صہیونی مسیحی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان پر فرض ہے کہ وہ اللہ کی مدد کریں اور اسرائیل کا سیاسی و اجتماعی بازو بن کر اللہ کے پیغامات کو عملی جامہ پہنائیں اور جسمِ مسیح کے ذریعے صرف انجیلی منصوبے کو بروئے کار لانے پر اکتفا نہ کریں۔

صہیونی مسیحیت کی تحریک کے ایک بڑے مفکر پوپ والٹر ریگنز (Walter Reggans) کا کہنا ہے: ’توراتی صہیونیت ہی ہر مسیحی کی یقینی آرزو ہے کیونکہ یہ بنیادی طور پر اللہ اور اس کے مقاصد سے ہم رشتہ ہے، اسی لیے مسیحی نظریے کی رو سے، صہیونیت مذہبی الٰہیات کا حصہ ہے، اس کا محض سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ مسیحی نقطۂ نظر سے اسرائیل کی ریاست یہودی قوم کے لیے الٰہی عمل کا محض آغاز ہے۔ مسیحیوں پر صرف ریاستِ اسرائیل کی مدد ہی فرض نہیں بلکہ اس کی پالیسی کے ساتھ تعاون بھی ضروری ہے۔ یعنی اُن پر اصولی طور پر اللہ کی ریاست اسرائیل سے، اسے اللہ کی رحمت الٰہی کا اشارہ سمجھتے ہوئے، مکمل تعاون فرض ہے۔ نیز یہ ایمان رکھنا بھی ان پر فرض ہے کہ ریاستِ اسرائیل توراتی عندیے کی غماز ہے کہ اللہ اس عالم کے مسائل سے حد درجہ دلچسپی لے رہا ہے‘۔

گریس ہیلسل (Grace Halsel) نے، جو وہائٹ ہاؤس میں سابق امریکی صدر لنڈن جانسن کی سیکرٹری رہ چکی ہیں، اپنی دو کتابوں ’نبوت و سیاست‘ (Prophecy and Politics) اور ’اللہ کا ہاتھ‘ (Forcing God's hand) میں ’صہیونی مسیحیت‘ پر بہت زیادہ لکھا ہے اور امریکہ میں اس کی ’سیادت و حکومت‘ اور بھرپور اقتدار و اختیار پر سیر حاصل و مدلل گفتگو کی ہے۔ ان کے مطابق ذرائع ابلاغ پر اسی کی حکومت ہے، اس کے پاس ۱۰۰ ٹیلی وژن اسٹیشن اور ۱۰۰۰ ریڈیو

اسٹیشن ہیں۔ امریکہ کے چپے چپے پر اس کی حکمرانی ہے۔ اس تحریک کے ہم نوا گرجا گھروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، جن کے ۸۰ ہزار پادری میدانِ تبلیغ میں سرگرم کار ہیں۔ بیسویں صدی کے صرف آٹھویں عشرے میں صہیونی مسیحیت کے پروگرام کے تحت اسرائیل کے ہم نوا ۲۵۰ ادارے اور انجمنیں معرض وجود میں آئیں۔ جن پادریوں اور قائدین مسیحیت کو وقار و اعتبار حاصل ہے، ان میں سے اکثریت صہیونی مسیحیت سے نہ صرف جڑے ہوئے، بلکہ اس کے سرگرم داعی اور سپاہی ہیں جیسے ہیل لیڈسی، جیری فال ویل، پاٹ روبرٹسن، چارلس ڈایر، مائک ایونز، گون والورڈ، ڈیو بینٹ وغیرہ — اس تحریک کی جڑیں برطانیہ میں بھی پیوست رہی ہیں۔ اس وقت وہاں کے ڈیویڈ پوسن، ڈیرک پرنس، لینس لمبرٹ، والٹر ریگنز وغیرہ اس تحریک کے مضبوط ستون ہیں۔

اسرائیل اور مسئلہ فلسطین سے متعلق سیاسی مؤقف کو مذہبی تصورات سے ہم رشتہ کرنے کے نظریے پر زور دینے والی جو کتابیں، مذکورۃ الصدر پادریوں اور مسیحی قائدین نے، صرف گذشتہ صدی کے آخری عشروں میں مختلف عنوانات کے تحت لکھی ہیں، وہ خاصی کثیر الاشاعت ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں: ’آٹھویں دہائی اور ہرمجدون کی الٹی گنتی؛ ہولوکاسٹ کی راہ؛ آخری معرکہ؛ عرب تیل اور ہرمجدون؛ غیر مقدس جنگ؛ تیل، اسلام اور ہرمجدون؛ اسرائیل یعنی امریکہ کے نجات کی کلید؛ ہرمجدون، تیل اور مشرق وسطی کا بحران؛ آخری المیہ، جنگِ خلیج کے بعد ہرمجدون کی ابتداء؛ امن ترقی اور آخری ہولوکاسٹ۔

امریکہ میں صہیونی مسیحیت کی تحریک کے ماننے والوں کی تعداد اس کے بعض علم برداروں کے مطابق دس کروڑ ہے، لیکن تحریک سے پرخاش رکھنے والے امریکی انجیلی کلیسا کے ہم نوا، ان کی تعداد ڈھائی تین کروڑ ہی بتاتے ہیں، تاہم یہ لوگ بھی یہ مانتے ہیں کہ یہ لوگ بہت تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ اس تحریک کو برپا کرنے والی ۲۲۰ سے زیادہ تنظیمیں اس بات کی مدعی ہیں کہ ان کے تحت سرگرم عمل افراد کی تعداد کم از کم ۴ کروڑ ہے۔

صہیونی مسیحیت کے علم بردار، صرف امریکہ و برطانیہ کے بہت سارے مسیحی پادری ہی نہیں تھے اور ہیں، بلکہ اکثر امریکی صدور، سیاستدان اور حکمران اسی نظریہ و تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔ صدر

لنڈن بی جانسن جو بیسویں صدی کے نصفِ آخر کے اوائل میں امریکہ کے صدر تھے، اس تحریک کے سرگرم قائدین میں شمار ہوتے ہیں۔ صدر جمی کارٹر تو اس حوالے سے اتنے پر جوش داعی گزرے ہیں کہ انہوں نے خود یہ اقرار کیا تھا کہ ان کے صہیونیت حامی جذبات ہی مشرق وسطیٰ کی ان کی سیاست کے رنگ و آہنگ اور سمت کا تعین کرتے تھے۔ انہوں نے مئی ۱۹۷۸ء میں اپنے ایک خطاب میں یہ تک کہا تھا کہ ''ریاستِ اسرائیل، ارض توریت کی طرف لوٹنے سے عبارت ہے، جہاں سے یہودیوں کو سیکڑوں برس قبل نکال دیا گیا تھا۔ اسرائیلی قوم کی اپنی زمین میں اقامتِ نو، تورات کی پیش گوئی کو برپا کرنا ہے'' (امریکی فیصلے میں مذہب کا عمل دخل از محمد سماک، ص ۴۲-۴۱)۔

مبصرین کا خیال ہے کہ صدر رونالڈ ریگن صہیونی مسیحیت کے عقیدے پر کاربند سب سے طاقت ور امریکی صدر رہے ہیں۔ انہیں یہ عقیدہ اپنی ماں نیل سے وراثت میں ملا تھا۔ ان کا عہد صدارت امریکہ میں اس عقیدے کے اثر ورسوخ کے حوالے سے سنہری دور باور کیا جاتا ہے۔ ان کے صدر منتخب ہونے سے امریکہ کی تاریخ میں اسرائیل کو امریکہ کی طرف سے سب سے زیادہ طاقت وحمایت اور مدد ملی تھی، نیز مختلف انتظامی ڈھانچوں کے بڑے بڑے ذمہ دار صہیونی مسیحی عقیدے کے حامل اور اسرائیل کو امریکی ریاست کا حصہ، بلکہ امریکہ کو ریاست اسرائیل کی مرضی و مفاد کے مطابق ڈھالنے اور چلانے کے قائل اور اس پر عامل تھے جن میں وزیر انصاف ایڈمیس وزیر دفاع کیسپر ونبرگر اور وزیر داخلہ جیمز واٹ انتہائی غالی عقیدے کے صہیونی مسیحی تھے۔ اسی عقیدے کے تناظر میں صدر ریگن نے ۱۹۸۶ء میں لیبیا پر اپنی افواج سے بمباری کروائی، کیوں کہ وہ لیبیا کو 'دشمن خدا' باور کرتے تھے۔ امریکہ اور اسرائیل نے اپنی مشترکہ جدوجہد سے ۱۹۸۲ء میں فلسطینی افواج کو لبنان سے کھدیڑ دیا تو ریگن نے اس کو امریکہ کے لیے باعث افتخار کارنامہ گردانا تھا۔

ریگن کے بعد دو صدورِ امریکہ یعنی جارج بش سینئر اور بل کلنٹن کے زمانے میں مبصرین کے مطابق صہیونی مسیحیت کی لَے بہ وجوہ دھیمی پڑ گئی، جس کی وجہ سے اس کے علم بردار پادری اور قائدین مسیحیت پیچ وتاب کھاتے رہتے تھے، اس لیے جیسے ہی جونیئر بش کا دور آیا، تو صہیونی مسیحیت کا کردار دھماکہ خیز طور پر عود کر آیا اور اس عقیدے کے پنڈتوں نے یہ طے کرلیا کہ نہ صرف ماضی کا حساب

بے باق کرنا ہے بلکہ اسرائیل کے مفادات کو بروئے کار لانے اور مسیحیت کو یہودیت کا وفادار خادم بلکہ بے دام غلام بنا ڈالنے کے عمل کو اپنے آخری انجام تک پہنچا کے دم لینا ہے۔

صہیونی مسیحیوں نے اسی دور میں محرف توریت کے ۳۳ویں پارے کی اللہ کی طرف سے موسیٰ کو کی گئی نام نہاد وصیت کو برپا کرنے اور اس کے لیے وسیع تر ذرائع استعمال کرنے کی ٹھان لی۔ اس وصیت میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو ارض کنعان یعنی فلسطین کا حقِ وراثت تفویض کر دیا ہے لہٰذا تمہیں اس زمین سے سارے ساکنانِ اجانب کو کھدیڑ دینا ہے۔ اگر تم اپنے سامنے یہ کام نہ کر سکے تو وہ تمہارے لیے آنکھوں کا تنکا ثابت ہوں گے اور تمہاری کمر میں کانٹے چبھوئیں گے اور تمہاری زمین میں تمہاری زندگی کو مکدر کیے رہیں گے'۔

ان مسیحیوں کا پختہ عقیدہ ہے کہ جب تک فلسطین کو مکمل طور پر یہودی نہیں بنا دیا جاتا اور وہاں سے ایک ایک عربی کو نکال باہر نہیں کیا جاتا تب تک مسیح کا نزول یا ان کی ولادت نو نہیں ہوسکتی۔ فلسطینیوں سے ارض فلسطین کی تطہیر جتنی جلدی ہوگی اتنی ہی جلد نزولِ مسیح کا مبارک دن وقوع پذیر ہوگا۔

امریکہ کے ایک مسیحی پادری پاٹ رابرٹسن، جسے مذکورہ عقیدے کی سب سے طاقت ور شخصیت باور کیا جاتا ہے، کے خیالات، اس کی زبان اور اس کا اندازِ کلام، عرب اور فلسطینی مسلمانوں کے خلاف اسی طرح جارحانہ ہے جیسے ہندوستان کے سنگھی خاندان کے شعلہ نو اور آتش فشاں حضرات کا ہوا کرتا ہے۔ اس پادری نے ۱۹۶۰ء میں تقریباً ۲۰ کروڑ ڈالر کی لاگت سے سی بی این (Christian Broadcasting Network) قائم کیا تھا جو دنیا میں سب سے اہم اور مؤثر مسیحی مذہبی ٹیلی وژن اسٹیشن ہے۔ اس نے ۱۹۸۹ء میں Christian Coalition نام کی تنظیم قائم کی جس سے اب تک تقریباً دو کروڑ امریکی وابستہ ہو چکے ہیں۔ اس تنظیم کا مقصد صرف یہ ہے کہ صہیونی مسیحی نظریے سے وابستہ امریکی صدارت کے امیدواروں کی مالی اور اخلاقی مدد کی جائے، چنانچہ ۲۰۰۰ء میں جونیئر بش کے لیے اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا جو ساری دنیا کو معلوم ہے۔ اسی تحریک کے زیر اثر اکتوبر ۱۹۹۵ء میں امریکی کانگرس کے ایوانِ بالا و زیریں دونوں نے بیت

المقدس کو اسرائیل کا دارالحکومت قرار دیے جانے کی قرار داد پاس کی اور یہ بھی کہ امریکی سفارت خانے کو تل ابیب سے وہیں منتقل کر دیا جائے۔ کیتھولک، آرتھوڈکس اور انجیلی کلیسا سے وابستہ سارے ممبران اس قرارداد کے خلاف تھے۔ اس کے باوجود یہ قرارداد نہ صرف منظور کی گئی بلکہ اس قرارداد کی ستمبر ۲۰۰۲ء میں دوبارہ توثیق کی گئی جب جونیئر بش نے اس پر اپنے دستخط ثبت کیے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ تحریک امریکہ میں کتنی طاقت ور اور اثر و رسوخ کی مالک ہے۔ صہیونی مسیحیت کے عقائد کو سیاسی طور پر برپا کرنے کے لیے مندرجہ ذیل امور پر عمل کیا جا رہا ہے:

۱۔ یہودی اللہ کی منتخب قوم ہیں لہٰذا ریاستِ اسرائیل کی حمایت اور ہر طرح سے اس کی مدد مسیحیوں پر بھی فرض ہے۔

۲۔ یہ ایمان رکھنا مسیحیوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ اللہ نے قوم یہود کو ارضِ مقدس یعنی فلسطین عطا کر دی ہے، لہٰذا وہاں بنائی جانے والی کالونیوں اور فتح کی ہوئی زمینوں پر یہودی قبضے کی حمایت واجب ہے۔

۳۔ بیت المقدس قوم یہود کو خدا کی طرف سے عطا کردہ ارض مقدس کا جزو لاینفک ہے، لہٰذا اسے اسرائیل کا پایۂ تخت تسلیم کرنا مسیحیوں پر بھی فرض ہے۔

۴۔ مسیحیوں پر واجب ہے کہ وہ یہ ایمان رکھیں کہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر، مسیح کی دوبارہ واپسی کے لیے ناگزیر شرط ہے، لہٰذا اس راہ کی ساری رکاوٹوں کو دور کرنا ان کے لیے بھی ضروری ہے، جن میں مسجد اقصیٰ کا انہدام بھی شامل ہے۔

۵۔ معرکۂ ہرمجدون کے یقینی ہونے پر ایمان لانا مسیحیوں پر فرض ہے۔ یہ معرکہ مسیح کی واپسی سے پہلے ضرور پیش آئے گا۔ اس لیے مشرق وسطیٰ میں مساعیِ امن کو سبوتاژ کرتے رہنا، پیہم انتشار برپا کیے رکھنا اور عرب و یہود دشمنی کو تازہ اور مؤثر بنائے رکھنا دینی عمل کا حصہ ہے۔ مساعیِ امن کے مؤثر ہو جانے سے ہرمجدون کے معرکے میں تاخیر ہوگی اور مسیح کی واپسی مؤخر ہوگی جب کہ اسرائیل و عرب رسہ کشی سے ان کی واپسی بعجلت اور یقینی ہوگی!

جونیئر بش کے صدر بننے کے بعد اسرائیل اور صہیونی مسیحیت کی خوش قسمتی، دنیا کی بدقسمتی اور

مسلمانوں کی آزمائش کے خدائی فیصلے کے تحت دو ایسے طاقت ور محرکات جمع ہو گئے، جن کی وجہ سے وہ سب کچھ بعجلت اور دھما کہ خیز انداز میں روبہ عمل آیا جسے مسلمان اب تک بھگت رہے ہیں۔

ا۔ ایک یہ کہ جونیئر بش، صہیونی مسیحی تحریک کی طاقت ور سیاسی شخصیت اور اسرائیل و یہود کے سب سے بڑے پشتی بان امریکہ کے صدر کی حیثیت سے نہ صرف نمودار ہوا بلکہ اس نے اپنی ساری حرکات وسکنات سے مذکورہ تحریک کا وفادار غلام اور بے لوث خادم ہونے کا ثبوت دیا اور نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے بھیانک جرائم پر بار بار فخر کا اظہار کیا بلکہ ان جرائم کو اپنی نجات، امریکہ کی عزت وسرخ روئی اور مغربی و امریکی متمدن ومہذب قوم کی سربلندی کا بار بار بے تکان اور ہر موقع وجگہ پر یقینی ذریعہ بتایا۔

بش کے اس عقیدہ وعمل کے سرگرم داعی اور پرجوش سپاہی ہونے کی وجہ سے اس تحریک کے سارے قائدین اور اہل کار اس کے گرد اس طرح اکٹھے ہو گئے جیسے مقناطیس کے گرد لوہا۔ جس کی وجہ سے بش کے جوش و جذبے میں مزید اُبال آیا۔ چنانچہ عیسائیوں کی عید کبیر کی عبادت والے دن ۲۰۰۳ء میں جہاں بش نے صہیونی مسیحیت کے ایک بڑے داعی پادری فرینکلن گراہم کو اس کے سامنے ان الفاظ میں سراہا کہ ہمارے دل میں انہی نے 'ایمان' کی جڑیں گہری کی ہیں، میں منشیات کے استعمال سے باز آ گیا ہوں اور مسیح کو میں نے گلے لگا لیا ہے، وہیں فرنکلین نے اسی تقریب میں صاف لفظوں میں یہ کہہ کر بش کو اسلام کے خلاف مزید اکسایا کہ 'اسلام ومسیحیت میں وہی فرق ہے جو تاریکی اور روشنی میں'۔

۲۔ دوسرا محرک، جسے پہلے محرک سے غذا ملی، اس شکل میں نمودار ہوا کہ صہیونی مسیحیت کی تحریک سے وابستہ ساری انجمنیں اور تنظیمیں پہلے سے زیادہ منظم، طاقت ور، مؤثر اور نہ صرف ابلاغی اور مذہبی سطح پر زیادہ فعال بن گئیں بلکہ وہ ایسی سیاسی طاقت بن کر ابھریں کہ ان کی حمایت کے بغیر صدر اور دیگر سیاستدانوں کا داخلہ وخارجہ پالیسی میں کوئی قدم اٹھانا ممکن نہ رہا۔

یہود دوست و اسرائیل کی حامی صہیونی مسیحیت کے قائدین اور منصوبہ ساز ارکان نے سوچا کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنی کے جذبات کو دوآتشہ بنا کر وسیع تر صلیبی صہیونی مشترکہ مفادات

کو بروئے کار لانے کا یہی سنہری موقع ہے لہٰذا اسے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے چنانچہ بہت سوچ سمجھ کر ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک اور واشنگٹن میں دھماکوں کا واقعہ برپا کیا گیا جو صہیونی مسیحیوں اور صہیونی یہودیوں کی مشترکہ کارستانی اور منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا، لیکن ہوشیاری و مکاری سے اسے مسلم عرب نوجوانوں کے سر منڈھ دیا گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس دعوے کو صحیح طور پر اب تک ثابت نہ کیا جاسکا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے اور نہ اس دعوے کے ان بہت سارے تضادات کو دور کیا جا سکا اور نہ ان پیچیدہ سوالات کا کوئی تشفی بخش جواب دیا جا سکا جو عربوں اور مسلمانوں پر ان دھماکوں کے الزام سے براہ راست اور منطقی طور پر پیدا ہوتے تھے لیکن نہ صرف امریکی اور اہل مغرب بلکہ مشرق و مغرب کے سارے 'انسانیت نواز' اور 'ہمدردانِ فرزندانِ آدم' اٹھ کھڑے ہوئے اور مسلمانوں کو سب وشتم کرنے، ان سے انتقام لینے اور نام نہاد القاعدہ والوں سے حساب بے باق کرنے کی ایسی رٹ شروع کی کہ اللہ کی پناہ! صہیونی مسیحیوں اور اسرائیلی لابی کو بالخصوص امریکہ اور بالعموم پوری دنیا میں اسرائیل کی نیکی، یہودیوں کی معصومیت، صہیونیوں کی بے گناہی و خدا ترسی کا ڈھنڈورا پیٹنے اور اس کے بالمقابل مسلمانوں کی شیطنت، شر پسندی، خون آشامی، انسانیت دشمنی، تہذیب ناآشنائی اور تمدن سے بیگانگی کو طرح طرح سے اتنی بار، اتنے دنوں تک، اتنی زبانوں میں، اتنے سارے ذرائع ابلاغ کے ذریعے اچھالا گیا اور ان پر دھاوا بولنے، ان کو تہ تیغ کرنے، ان کے ملکوں، ان کی تاریخ، تہذیب و ثقافت، ثروت و دولت اور غیر منظم رہی سہی عسکری و سیاسی و اقتصادی طاقت کو کچلنے اور مسیحی و یہودی خدا کی عظمت کے گن گانے کی اس طرح راہ ہموار کی گئی کہ مسلمانوں کے ہوش اڑ گئے اور دنیا کے سارے 'انصاف پسندوں' کی صلیبیت وصہیونیت نوازی دیکھ کر مسائل کو صحیح تناظر میں دیکھنے والے انگشت بدنداں رہ گئے۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات کے برپا کنندہ بالیقین صہیونی یہودی اور صہیونی مسیحی تھے۔ اس سلسلے میں اتنا کچھ دنیا کی ساری زبانوں میں لکھا، بولا اور نشر کیا گیا ہے کہ اب مزید کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ خود امریکہ میں بڑے بڑے اہل قلم اور دانشوروں نے انتہائی مدلل انداز میں ان دھماکوں کو یہودیوں اور امریکہ کی اسرائیل نواز صہیونی مسیحی لابی کا کارنامہ قرار دیا ہے۔

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے دھماکوں کے بارے میں جو سیکڑوں ویب سائٹس انٹرنیٹ پر موجود ہیں، ان میں ۷۰ ممتاز سائنس دانوں اور اعلیٰ پروفیسروں کی ''اسکالرز فار نائن الیون ٹرتھ ویب سائٹ'' نمایاں ہے۔ ان سائنس دانوں اور پروفیسروں کو اپنی تحقیق وجستجو اور تجربے کی روشنی میں یقین ہے کہ ان دھماکوں کا مقصد وہائٹ ہاؤس کی طرف سے ''دہشت گردی'' کے خلاف جنگ، مشرق وسطیٰ پر مزید کنٹرول، وہاں کی دولت کی لوٹ کھسوٹ، اسرائیل کی برتری کو تقویت دینا اور عربوں کے تیل پر قبضہ کرنا تھا۔ ایک امریکی تجزیہ نگار نے یہ بات واضح کردی ہے کہ اسامہ بن لادن نے ۱۱ستمبر کے حملوں کو اپنی کامیابی کا جس ویڈیو میں دعویٰ کیا تھا، وہ یقیناً جعلی تھا، کیونکہ اس میں اسامہ کی ناک ایک انچ چھوٹی تھی، بالیقین اس میں کسی اداکار کو استعمال کیا گیا تھا۔ ایف بی آئی کے ترجمان لیبل ایڈمنڈس کو امریکی انتظامیہ نے اس لیے مہر بہ لب کردیا ہے کہ اس کے پاس ۱۱ستمبر کے متعلق بہت سی ایسی سچائیاں ہیں جن سے صہیونیوں (یہودیوں اور مسیحیوں دونوں) کی بڑی رسوائی ہوسکتی ہے۔ اس کا یہ کہنا ہے کہ اسامہ کے وہ ۴ ویڈیو ٹیپس ہی صحیح ہیں جن میں اس نے نائن الیون میں شرکت سے انکار کیا تھا۔ بعد کے وہ ٹیپس جن میں شرکت کی تصدیق ہے وہ جعلی ہیں۔ آواز اور شکل دونوں تراشیدہ ہیں۔

روزنامہ 'جسارت' کراچی نے پچھلے دنوں ''۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء خود ساختہ امریکی سازش'' کے عنوان سے بہت نتیجہ خیز اور تحقیقی کالم شائع کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ امریکی یونیورسٹی کے ایک ممتاز پروفیسر اسٹیونس جونس کو امریکی انتظامیہ نے محض اس 'گناہ' میں جبری رخصت پر بھیج دیا ہے کہ اس نے طویل جستجو اور بھرپور کوشش کے بعد یہ ثابت کیا کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارتیں صرف جہازوں کے ٹکرانے سے مکمل طور پر تباہ نہیں ہوسکتی تھیں بلکہ ایسا صرف اس صورت میں ممکن ہے جب انہیں اندرونی دھماکوں سے گرایا گیا ہو۔ اس نے ثابت کیا کہ ایسا ہی ہوا ہے لیکن آزادیِ رائے کا ڈھنڈورا پیٹنے والی سپر پاور اپنے ہی ایک دانش ور کی تحقیق ہضم نہ کرسکی اور اسے جبری رخصت پر بھیج دیا گیا۔ حال ہی میں یہ جائزہ بھی شائع ہوا ہے کہ امریکہ کے ۳۰ فیصد لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نائن الیون کا واقعہ خود امریکی حکومت نے کرایا تھا جس کا مقصد وہی کچھ تھا جو امریکہ اس وقت عالم اسلام کے

ساتھ کر رہا ہے اور مستقبل میں کرنے والا ہے۔ امریکی اور مغربی ذرائع ابلاغ کے زبردست پروپیگنڈے کے باوجود بھی اگر خود امریکہ کے ۳۰ فیصد لوگ خود امریکی انتظامیہ کے مذکورہ واقعے میں ملوث ہونے کی بات کہتے ہیں تو یہ غیر معمولی بات ہے کیوں کہ امریکیوں نے یہ خود دیکھا کہ امریکی سیکورٹی میں تاریخی ناکامی کے باوجود، اس واقعے کی داخلی ذمے داری کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا اور اس سلسلے میں کسی ایک اہم شخصیت کو بھی اس عہدے سے برطرف نہیں کیا گیا، حالانکہ اتنے بڑے واقعے کے بعد تو سیکڑوں اہل کار برطرف کیے جا سکتے تھے۔ مذکورہ امریکی پروفیسر کی تحقیق اگر غلط تھی تو امریکی انتظامیہ اس کی جوابی تحقیق پیش کر کے اس کو غلط ثابت کر سکتی تھی لیکن ایسا نہ کیا گیا۔ اس نے ایک اور غلطی یہ کی کہ پروفیسر کا منہ بند کرنے کے لیے اس کو جبری رخصت کی سزا دی۔ یہ حرکت خود ایک طاقت ور شبہے کو جنم دیتی ہے اور اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ امریکی حکومت نے نائن الیون کو ایک 'مقدس عقیدے' کی حیثیت دے دی ہے کہ جس طرح مغرب میں ہولوکاسٹ پر بات نہیں کی جا سکتی اسی طرح امریکہ میں نائن الیون پر سوالات قائم نہیں کیے جا سکتے ۔ یہ صورت حال امریکی حکومت کے کمزور مؤقف کی آئینہ دار ہے اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

ان محرکات کی کوکھ سے اسلام سے نفرت کے اس دیرینہ کلچر کو، جو صہیونی میسیحیت کی تعلیمات کی اساس ہے، مزید پھیلنے کا موقع ملا اور اسی کلچر کو امریکہ کے سیاسی فیصلوں اور عسکری سرگرمیوں کا محور مان لیا گیا۔ پادری 'ہال لینڈسی' نے صہیونی امریکیوں کو یہ کہہ کر للکارا کہ 'مسلمانوں کا نشانہ صرف ریاست اسرائیل کی بیخ کنی نہیں بلکہ وہ یہودی مسیحی کلچر کو نیست کرنے کے درپے ہیں، جو تہذیبِ مغرب کی اساس ہے۔ یہ کمیونسٹوں کی طرح ہیں اوران کے فکر و نظر کی گہرائیوں میں ہم سبھوں کو بالکلیہ دفن کر دینے کی ناقابلِ بیان خواہش تڑپ رہی ہے'۔ پادری 'پاٹ روبرٹسن' نے اسلام کو 'دہشت گردی کا مذہب' کہا جس کا مقصد پوری دنیا کو زیر کرنا ہے۔ اس نے امریکی مسلمانوں کو 'دہشت گردی کا زیر زمین نظام' قرار دیا جس کا مقصد امریکہ کو نیست و نابود کرنا ہے۔ پادری 'جیری فائن' نے آگے بڑھ کر خود آنحضرت ﷺ کے خلاف زبان طعن دراز کی۔ پادری فرینکلین گراہم نے جونیئر بش

کی صدارت کا حلف لینے کی تقریب میں اسلام کو 'شیطانی اور شر پسند مذہب' بتایا جب کہ پادری جیری فولویل نے اسے ''مصنوعی مذہب'' سے تعبیر کیا۔

الغرض یہ محرکات اس لیے تخلیق کیے گئے تھے کہ اسلام و مسلمانوں کے خلاف ان کے گھروں میں اور پوری دنیا میں ایسی ہمہ گیر اور دور رس جنگ دھماکہ خیز سطح پر اس طرح چھیڑ دی جائے کہ جس کی، ان کے عندیے کے مطابق، مسلمان تاب نہ لاسکیں کیوں کہ یہ کثیر المحاذ جنگ عسکری، فکری، ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی سطحوں پر لڑی جارہی ہے جسے انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی بالکلیہ تباہی کا حتمی ذریعہ باور کیا ہے۔

یہودی اور مسیحی صہیونیت نے جونیئر بش اور اس کے انتظامی ٹولے کو بدمست ہاتھی بنا دینے میں ایسی کامیابی حاصل کی جو عالم اسلام کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے حوالے سے صہیونیت کے حصے میں پہلے کبھی نہ آئی تھی۔ صدر بش کی بدمستی کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی لمحہ اپنی عقل سے بھی مشورے کا طالب نہ ہوا اور نہ اس کے دل میں خیر وشر کے امتیاز کا کبھی کوئی جذبہ بیدار ہوا۔ وہ حد درجہ منفی اور شر انگیز جذبات سے ایسا مغلوب ہوا کہ اسلام اور عالم اسلام کے خلاف ہمہ گیر 'صلیبی جنگ' لڑنے کا اعلان کردیا اور معاصر انسانی معاشروں کے متعلق یہ فیصلہ سنا دیا کہ مغربی امریکی معاشرہ مہذب اور اس کے سوا یعنی اسلامی مشرقی معاشرہ غیر مہذب ہے اور جو اس کے (یعنی بش) ساتھ نہیں وہ بالیقین اس کے خلاف ہے، لہٰذا وہ اس کی طرف سے عبرت ناک سزا کا مستحق ہے چنانچہ وہ عالم اسلام کو عبرت ناک سزا دینے میں جت گیا۔

'نیو یارک ٹائمز' کے کالم نگار جاکسن لیرز نے اخبار کے ۱۱ مارچ ۲۰۰۳ء کے شمارے میں اپنے مضمون میں واضح طور پر لکھا کہ بش کا عقیدہ ہے کہ معاصر واقعات ایک انصاف پسند ونجات دہندہ مسیحی اور یہودی خدا کے ہاتھوں انجام پذیر ہورہے ہیں۔ نیز بش یہ سمجھتا ہے کہ اس کی صدارت ایک 'مقدس منصوبے' کا حصہ ہے۔ اس نے ٹکساس صوبے کی گورنری کے زمانے میں اپنے ایک دوست سے کہا تھا کہ خدا نے اسے امریکہ کی صدارت کی امیدواری کا حکم دیا ہے اور ریاست ہائے متحدہ کو مشرق وسطیٰ میں آزادی کی صلیبی مہم چھیڑنے کو کہا ہے۔ بش کا خیال ہے کہ اس کی ساری

حرکات وسکنات خدائی تعلیمات اورالٰہی ارادوں کی تنفیذ سے عبارت ہیں۔

۶ اکتوبر ۲۰۰۵ء (یکم رمضان ۱۴۲۶ھ) کو بی بی سی لندن نے ایک دستاویزی پروگرام میں بتایا تھا کہ جون ۲۰۰۳ء میں بش نے نام نہاد فسلطینی مقتدرہ کے وزیر اطلاعات نبیل اشعت سے وہائٹ ہاؤس میں کہا تھا کہ اس کی عسکری سرگرمیاں خدا کے پیغام کی ترجمانی کرتی ہیں۔ خدا نے اس سے کہا کہ عراقی اقتدار کو ختم کردو اور افغانی انتظامیہ کو تبدیل کردو چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اب اسے محسوس ہورہا ہے کہ اس وقت خدا کا حکم ہے کہ فلسطینیوں کے لیے ایک ریاست کا قیام عمل میں لاؤ، اسرائیل کے لیے سیکورٹی فراہم کرو اور وہ یہ سب کچھ کر کے رہے گا۔

افغانستان کی اسلامی حکومت کی تباہی، اس کی ہمہ گیر بربادی جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، عراق کے خلاف جنگ وقبضہ اور وہاں 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی کا نفاذ، اس کے حصے بخرے کردینے کے منصوبے پر عمل، یہودیوں کی وہاں دندناہٹ، فسلطینیوں پر آتش وآہن کی بے طرح بارش اور انہیں دوڑا دوڑا کے مارنے، بھوکوں تڑپانے، خاک وخون میں لوٹانے کی مشق، سعودی عرب، کویت، قطر، عمان، بحرین وغیرہ کی عسکری ناکہ بندی بلکہ جکڑ بندی اور سعودی عرب میں 'دہشت گردی' کا عفریتی وساحرانہ کھیل، ان ملکوں میں دینی نصابوں کی تبدیلی، تاریخی وثقافتی میراث کی بربادی، رفاہی کاموں پر طرح طرح کی پابندی، مذہبی سرچشموں کو خشک کر دینے کا عمل، اسلامی شعائر پر حملہ، نبیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب وشتم کیے جانے کی تحریکِ مسلسل اور اسلامی وعربی ملکوں پر یکے بعد دیگرے نشانہ باندھنے کی 'رسم وراہ' اسی حرفِ کراہیت اور عقیدۂ بد کی تفسیریں ہیں جو روبہ عمل لائی جارہی ہیں۔

مسیحی بنیاد پرستی اور یہودی عالمی صہیونیت کے عشقِ بے پناہ کا رنگ، جتنا چوکھا ہوتا جائے گا، اسلام اور مسلمانوں پر مشقِ ستم میں اسی قدر شدت آتی جائے گی کیوں کہ یہ بنیاد پرستی انتہائی خطرناک ہے۔ اس کے شعور ولاشعور دونوں کی گہرائی میں یہ خیال جاگزیں ہے کہ اس کے ماننے والوں کا قول و فعل ماورائے تاریخ وارادۂ انسانیت غیر مرئی قانون کی دین ہیں، اسی لیے بش نے اپنے خیالات سے متصادم حقائق سے یکسر چشم پوشی اور کورمغزی کا رویہ نہ صرف یہ کہ اختیار کیا بلکہ عالمی برادری اور امریکہ کے تاریخی حلیفوں کے ذریعے بہ اصرار راہِ صواب سمجھائے جانے کو امریکہ دشمنی اور اسرائیل دشمنی

گرداننے ہوئے جنگ کے شعلوں کو اس طرح فروزاں کیا کہ امریکہ کے وقار کے سارے سرمایے بھسم ہوجانے کے باوجود وہ انہیں بجھا دیے جانے کا مشورہ دینے والوں کی بات ماننے کے لیے نہ صرف یہ کہ تیار نہیں ہوا، بلکہ انہیں نامعقول، بے وقوف اور انسانیت دشمن خیال کرتا رہا۔ بش کے لیے ماضی کی طرف لوٹنا ممکن نہیں اور آگے کی طرف گہری کھائی کے سوا کچھ بھی نہیں، لیکن عقیدہ وعمل کے جس جہنم کا ایندھن وہ بن رہا ہے، اس کی وجہ جہاں اس کی مذہبی وعملی گمراہی ہے وہیں گمراہی پر اس کے ثابت قدم رہنے کے ایسے اسباب بھی ہیں جن کا ازالہ ممکن نہیں۔ بش کے رفقائے کار، خواہ وہائٹ ہاؤس کے اندر ہوں یا وزارتِ دفاع میں، ان میں سے اکثر ایسے امریکی یہودی ہیں جو دوہری نیشنلٹی رکھتے ہیں اور سابقہ اسرائیلی حکومتوں میں مشیر رہ چکے ہیں، وہ جہاں امریکی ہیں وہیں یہودی بھی ہیں۔ یہ بدبخت رفقا، بش کی خوں خواری میں اضافہ اور عربوں اور مسلمانوں کے خون کی لذت وافادیت سے اس کو بار بار آگاہ کرتے رہتے ہیں کہ اس کو پینے سے دنیا وعقبیٰ کا ہر مرض زائل ہوجاتا ہے۔ بش کی خوں خواری کا اندازہ اس کے جون ۲۰۰۲ء میں امریکہ کے ایک عسکری اڈے میں اس اعلان سے ہوسکتا ہے جو امریکہ کی تاریخ میں کسی صدر نے نہیں کیا تھا: ''مستقبل میں امریکی افواج کے لیے ضروری ہے کہ خطرات کے حقیقت واقعہ بننے سے پہلے وہ مطلوبہ عسکری سرگرمی انجام دینے میں عجلت سے کام لیں، اس لیے کہ امریکی سکیورٹی سارے امریکیوں سے اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ حفاظتی واحترازی عمل کے لیے بالکل تیار ہیں۔ ۸ مارچ ۲۰۰۳ء کی شب اردو سروس بی بی سی لندن نے کہا کہ امریکی صدر بش نے کہا ہے کہ عراق امریکہ کے لیے براہ راست خطرہ ہے، اس لیے اقوام متحدہ کی منظوری کے بغیر وہ عراق پر حملہ کرے گا۔ افغانستان وعراق اور عالم اسلام وعرب کے خلاف امریکہ کی وسیع تر جنگ امریکہ اور اسرائیل کے لیے وسیع تر حفاظتی عمل کا حصہ تھا اور ہے جو بش امریکیوں سے انجام دلوارہا ہے۔ 'حفاظتی و احترازی جنگ' کا اصول و کردار انتہائی سفاکانہ ہے جو صہیونی مسیحی صلیبی اور بنیاد پرست بش اور اس کے ٹولے نے تراشا اور اس کو برپا کرنا شروع کیا ہے۔ اس اصول کے تحت کسی بھی ملک پر کسی بھی وقت حملہ کیا جا سکتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے امریکہ اور انسانیت یعنی اسرائیل کو خطرہ تھا جو دور کردیا گیا۔

مذکورۃ الصدر پس منظر میں یہ بات، جو سارے باخبر مبصرین نے کہی اور لکھی ہے، زیادہ واضح اور ثابت ہوجاتی ہے کہ ایران عراق جنگ ہو یا عراق کو کویت پر چڑھ دوڑنے کی بیوقوفی کرنے کی تحریک وترغیب، اس کے بعد کی عراق کے خلاف امریکی جنگ ہو یا عراق پر طویل ہمہ گیر اقتصادی پابندی، اقوام متحدہ کی آڑ میں عراقی اسلحہ کی تفتیش کا اکتا دینے والا عمل ہو یا ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کا ڈرامہ اور پھر اس کے بہانے افغانستان کے خلاف عسکری عمل ہو یا عراق کو تہس نہس کرنا اور عالم اسلام پر ہمہ گیر حملہ، یا اسلامی شعائر اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تحقیر و استہزا، یہ سارا کچھ اسلام کے خلاف ایک مربوط و مسلسل جنگ کا عمل ہے، جو جاری ہے اور تادیر جاری رہے گا، کیوں کہ اس کا مقصد صہیونی مسیحی صلیبی مقاصد کو بروئے کار لانا ہے۔ چوں کہ صہیونیت زدہ مسیحیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مسیح کی ولادتِ نو کی تعجیل کے لیے اسرائیلی ریاست کی بہ ہر نوع حمایت ضروری ہے، اس لیے عقیدے کے سامنے عالمی برادری کی کسی بات کو ماننے کی چنداں ضرورت نہیں، اسی لیے بش نے بار بار یہ بات دہرائی کہ اقوام متحدہ عراق پر حملے کی منظوری دے یا نہ دے، امریکہ عراق پر بہر کیف حملہ کر کے رہے گا کیوں کہ اس نے اقوام متحدہ کی غیر مسلح ہونے سے متعلق قرارداد (۱۴۴۱) اور اس سے پہلے کی قراردادوں کو یکسر نظر انداز کیا ہے۔ گویا عراق نے اگر اقوام متحدہ کو نظر انداز کیا ہے تو آپ کو یہ حق ہے کہ اس کو، اقوام متحدہ کو نظر انداز کرنے کی سزا، اقوام متحدہ کو نظر انداز کر کے ضرور دیں۔ عجیب سی منطق ہے، لیکن مسلمانانِ عالم جو بے بس ٹھہرے تو ظاہر ہے کہ انہیں امریکہ، اسرائیل اور فرزندان صلیب وصہیونیت سے ہر طرح کی ضرب سہنی ہے اور تذلیل وتحقیر بھی اور ساتھ ہی ''بھینس'' بھی کھونی ہے، کیوں کہ انہوں نے ''لاٹھی'' کھونے کے گناہ کا مسلسل ارتکاب کیا ہے، لہٰذا جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔

جانی نقصانات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو نائن الیون کا واقعہ ایک معمولی واقعہ تھا اس لیے کہ اس میں ڈھائی پونے تین ہزار امریکی ہلاک ہوئے۔ اتنے مسلمانوں کو تو امریکیوں نے صرف افغانستان پر حملہ کر کے چند روز میں ہلاک کر دیا، اس کے بعد عراق میں حملہ کر کے ہر ہفتے اتنے مسلمانوں کو بھسم کرتے رہے ہیں۔ امریکہ، اس کے دم چھلہ برطانیہ اور مغربی ملکوں نے عراق پر دس

سال تک جو اقتصادی پابندیاں عاید کیں، ان سے دس لاکھ عراقی مسلمان صرف دوا اور غذائی قلت کی وجہ سے موت کا نوالہ بن گئے، جن میں پانچ لاکھ بچے شامل تھے۔ آپ نے مغربی اور امریکی ذرائع ابلاغ سے ان دس لاکھ معصوم انسانوں کے ضیاع کا کبھی تذکرہ بھی نہ سنا ہوگا، کیوں کہ مغربی و امریکی صلیبی و یہودی سونے کے بنے ہوئے ہیں اور مسلمان مٹی کے، لہٰذا اگر وہ چند سو بھی مر جائیں تو دنیا کے کونے کونے میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں اور اگر مسلمان لاکھوں کی تعداد میں بھی ان کے ہاتھوں مارے جائیں تو محض ان کی تعداد کے تذکرے کی بھی وہ ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

نائن الیون کے روز مرنے والے ڈھائی پونے تین ہزار مسیحیوں اور یہودیوں کی ہلاکت کو پورے عالم کی نفسیات پر مسلط کر کے، اس کی آڑ میں صہیونی اور مسیحی دن رات، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف، سازش، جنگ، نفرت کی نہ ختم ہونے والی لہر کی تخلیق، ہمارے مراکز و مدارس، نصاب ہائے تعلیم، ہماری تاریخ، تہذیب و ثقافت، ہمارے مذہب و پیغمبر، ہمارے علماء و قائدین، ہمارے دعاۃ و رفاہی کاموں کے ذمے داران، کے خلاف ایسا معرکہ بپا کیے ہوئے ہیں کہ پوری دنیا میں اور خود ہمارے گھروں کے اندر ہمارے لیے جینا مشکل ہوگیا ہے۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے پوری اسلامی دنیا مبتلائے اضطراب ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے حکمران، مغرب اور امریکہ کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں کیوں کہ ایمان کی کمزوری اور ضمیر کی موت کے حوالے سے وہ اپنا جواب آپ ہیں۔ اس لیے وہ امتِ مسلمہ کے خلاف کی جانے والی کارروائیوں میں امریکی حمایت میں مؤثر کردار ادا کر رہے ہیں۔ دنیا کی چند روز عزت و وجاہت کی چمک نے نہ صرف انہیں اندھا کیا ہوا ہے، بلکہ ان کی عقل بھی ماری گئی ہے۔ مسئلے کا خطرناک پہلو یہ ہے کہ مسلمان ہنوز اس ہمہ گیر اور بھرپور یلغار کے آگے کسی طرح کا بند نہیں باندھ سکے ہیں۔ اس حملے اور سازش کو اس کے ہمہ گیر تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے، اس کے بغیر اس کا فکر و عمل کی سطح پر مؤثر جواب دینا ممکن نہیں۔ اس حملے میں نائن الیون کی سازش کی تحت جو تیزی لائی گئی ہے، اس وقت سے اب تک کے طویل دورانیے میں یہ بات ہر مسلمان پر منکشف ہوگئی ہے کہ امریکہ، مغرب اور یہود کے ذریعے ہماری رسوائی اور تباہی کی اصل وجہ ہمارے ملکوں کے مغرب کے وفادار خادم اور غلام حکمراں ہیں، جن کے ذریعے یہود و فرزندانِ

تثلیث اپنے منصوبوں کو روبہ عمل لا رہے ہیں۔ انہیں ہر جگہ قبل از یلغار اور بعد از یلغار بہت سارے کرزئی اور مشرف مل جاتے ہیں۔ اگر یہ آڑے نہ آتے تو امتِ مسلمہ میں یہود و نصاریٰ کے ہر زہر کا تریاق فراہم کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔

بالیقین صہیونیوں کی کامیابی کا راز ان کی غیر معمولی ذہانت اور ان کی محض اقتصادی و ابلاغی برتری نہیں، بلکہ ان کے حکمران وعوام مسلمانوں کے خلاف اپنے منصوبوں کے نفاذ میں ہر وقت، ہر جگہ، ہر محاذ اور ہر سطح پر یک جان و یک آواز اور مکمل طور پر متحدہ ہیں، اسی لیے انہوں نے پوری دنیا میں ہمارے لہو کو پانی سے زیادہ ارزاں بنادیا ہے۔ ان کے توڑ سے ہم اس لیے عاجز ہیں کہ ہمارے ہاں عرصۂ دراز سے حکمرانوں اور امت کے عام افراد کے درمیان فکری و عملی سطح پر زبردست خلیج پائی جاتی ہے۔ الغرض ہم خارجی دشمن سے اتنے ستم زدہ اور شکست خوردہ نہیں ہیں جتنے داخلی دشمن اور مار ہائے آستین یعنی قائدین و حکام سے، جس دن ہمیں کسی طرح ان سے نجات مل گئی وہ پوری دنیا میں وہ ہماری برتری کا دن ہوگا (بشکریہ 'دعوت' دہلی)۔

استدراک

اس مضمون کو پڑھ کر ہمارے ایک دوست نے یہ تبصرہ کیا کہ یہود و نصاری جس طرح اتحاد کر کے مسلمانوں کو ذلیل و رسوا کر رہے ہیں اسی طرح مسلمانوں کو صہیونی عیسائی گٹھ جوڑ کے شر سے بچنے کے لیے ایسی حکمت عملی وضع کرنی چاہیے جس سے یہود و نصاری میں تفریق پیدا ہو۔ اسی طرح عالم اسلام کو امریکی شر سے بچنے کے لیے یہ کرنا چاہیے کہ جیسے تیسے بھی ہو وہ یورپ کی ہمدردیاں حاصل کر لے اور یورپ و امریکہ کے عالم اسلام کے خلاف اتحاد میں رخنے پڑیں بلکہ خود امریکی ریاستوں میں موجود اختلافات اگر بڑھ جائیں تو لوگوں کو اس عفریت سے پناہ ملنے میں آسانی ہو۔ امین

تزکیۂ نفس

علامہ احمد جاوید

اکتساب فضائل (۴)

توکل

س: توکل کی تعریف کیا ہے؟

ج: توکل نام ہے اپنی بجائے اللہ پر بھروسہ کرنے کا یا یوں کہہ لیں کہ خود کو اور اپنے تمام معاملات کو اللہ کے سپرد کر دینا اور اس پر مطمئن رہنا توکل ہے۔

س: دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ توکل سے یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی کوشش و عمل ترک کر کے محض اللہ کی مدد اور فضل کی امید پر بیٹھا رہے کیا یہ رویہ درست ہے؟

ج: ہرگز نہیں۔ اس رویے میں ایک طرح کا تکبر پوشیدہ ہے۔ ایسے لوگ اللہ پر اپنا حق جتاتے ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے پیدا کردہ تمام ممکنہ اسباب کو اختیار کرے اور پھر نتائج کو اللہ پر چھوڑ دے۔ جو نتیجہ بھی نکلے اس سے بددل نہ ہو اور اس رویے کو مرتے دم تک برقرار رکھے۔ توکل کا یہ مفہوم تھوڑی ہے کہ آدمی اللہ پر بوجھ بن جائے یا اسے معاذ اللہ امتحان میں ڈالے رہے۔

س: کیا توکل میں یہ بات داخل نہیں ہے کہ بندہ اپنے نفع ونقصان وغیرہ کو اللہ کی طرف سے سمجھے اور یہ یقین رکھے کہ اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوسکتا؟

ج: بالکل، یہ چیز تو توکل کی روح ہے۔ متوکل آدمی کوشش بھی دعا کی طرح کرتا ہے اور اس کی قبولیت کی کسی خاص شکل پر اصرار نہیں کرتا۔ عمل جس احتیاج سے پیدا ہوتا ہے وہ احتیاج بندگی کا خلاصہ ہے۔ خود کو عمل سے مستغنیٰ کر کے آدمی بندہ کہلانے کے لائق نہیں رہتا۔ بندگی کے جتنے بھی فضائل ہیں

وہ سب عمل سے اور عمل کے بعد حاصل ہوتے ہیں خواہ یہ عمل دینی ہو یا دنیاوی۔توکل کو بھی اس پر قیاس کریں اور اچھی طرح جان لیں کہ توکل اسی بندگی کی ایک صفت ہے جس کا جوہر مجاہدہ اور محتاجی ہے۔ جوہر کو منہا کر کے کسی شے کے وصف کا کوئی اعتبار نہیں۔

س: متوکل بننے کے راستے میں کون سی رکاوٹیں آج کے مسلمان کو درپیش ہیں؟

ج: تمام ضروریات بندگی میں نقص و کمال کا ایک ہی اصول ہے اور وہ ہے اللہ سے تعلق۔ یہ تعلق مضبوط ہے تو بندگی مجموعی طور پر کامل ہے اور اگر یہی کمزور ہے تو بندگی کا ہر پہلو ناقص ہے تاہم ہر فضیلت اپنا ایک ذاتی رنگ بھی رکھتی ہے لہٰذا اس کے مواقع اور محرکات کا رنگ سے بھی تعین کیا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے توکل سے محرومی یا اس میں کمزوری کے بنیادی اسباب یہ ہیں:

- حبّ دنیا
- تکبر
- ریا اور مخلوق پر بھروسہ
- طول امل

ان میں سے اس معاملے میں ہر ایک کے کردار کی ضروری تفصیل یہ ہے:

حب دنیا

توکل کے لیے حب دنیا زہر ہے۔ نفس کی جو خرابیاں بندے کو توکل بلکہ تعلق باللہ کی تمام صورتوں سے محروم کر دیتی ہیں حب دنیا ان میں سے ایک ہے۔ توکل کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ مجھے اللہ سے اپنے تعلق کی بہتری اور مضبوطی مطلوب ہے، اپنی مرضی اور خواہش پر چلنا مطلوب نہیں۔ دنیا کی محبت اس کے منافی ہے۔ یہ دنیا کو خدا سے بڑھ کر مطلوب بنا دیتی ہے اور اس شدت طلب میں جو چیزیں سب سے پہلے متاثر ہوتی ہیں توکل ان میں سے ایک ہے۔ غور سے دیکھیں تو بندگی کے دیگر ضروری فضائل کی طرح توکل بھی بندے اور مالک کے تعلق کی فطری طور پر متوازن صورت کا نام ہے۔ دنیا اس توازن میں یقیناً ایک کردار رکھتی ہے لیکن اس کی حیثیت اصولی طور پر اس احتیاج کو تقویت دینے والے عنصر کی ہے جو عبودیت کی روح ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں رہ کر بندے کو اپنے پروردگار اور حاجت روا پر اس بھروسے کا بھی ناگزیر طور پر ثبوت دینا پڑتا ہے جس کے بغیر بندگی محض ایک جبر کا نام تو ہو سکتی ہے مگر اس طاقت اور اختیار کی حاصل نہیں بن سکتی جو احتیاج ہی کی

طرح اسے حقیقی اور بامعنی بنا سکے۔ بالفاظ دیگر بندگی جس حاجت مندی، اعتماد اور اختیار سے عبارت ہے، توکل اس کی پوری نمائندگی کرتا ہے۔ دوسری طرف دنیا ہماری ضرورت بھی ہے اور ہمیں طبعاً مرغوب بھی ہے۔ضرورت اور رغبت کی یکجائی ادنیٰ کوسی اور تعلق کی شرائط ملحوظ رکھنے سے روک سکتی ہے یعنی دنیا کا ضروری اور مرغوب ہو جانا تعلق باللہ کی ایک ضروری شرط تسلیم و انقیاد کو اس طرح متاثر کرنے کی قوت رکھتا ہے کہ ہم اس تعلق کے اساسی تقاضے یعنی لامطلوب و لامقصود الا اللہ کو ابتدائی طور پر ہی پیش نظر رکھنے کے قابل نہیں رہتے۔ دنیا ایک پہلو سے اللہ کی نعمت تو ہے مگر اس کی محبت اسے اللہ کا بدل بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حب دنیا اور شرک یا کفر ہم معنی چیزیں ہیں اللہ سے دور لے جانے کی جتنی صلاحیت حبّ دنیا میں پائی جاتی ہے اتنی شرک اصطلاحی میں بھی نہیں۔ شرک پھر بھی عبودیت کے تصور کو بگاڑ کے ساتھ ہی سہی مگر محفوظ رکھتا ہے حب دنیا میں یہ بات بھی نہیں پائی جاتی۔

ترکِ رذائل

حبّ دنیا

حبّ دنیا یہ ہے کہ دنیا اس قدر مطلوب ہو جائے کہ آدمی اس کے حصول کا ہر ذریعہ، خواہ صحیح ہو یا غلط، اختیار کرلے اور اس بارے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی واضح ناراضی اور غضب کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ دنیا کی طلب اور محبت کا اللہ کی طلب اور محبت پر بداہتہً غالب آجانا حبّ دنیا ہے۔

حبّ دنیا نہ صرف یہ کہ تمام گناہوں کی جڑ ہے بلکہ اپنے شکار کو کفر، شرک اور جہنم تک پہنچا سکتی ہے جیسا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے متعدد ارشادات سے ثابت ہوتا ہے۔ حبّ دنیا کا علاج ہے اس تجربی صداقت کا استحضار کہ دنیا اور دنیا کی راحتیں خود اس کے طالب کے ساتھ فنا ہوجانے والی ہیں اور اس ایمانی حقیقت کی یاددہانی کہ آخرت اور اس کی راحتیں نہ صرف یہ کہ خود باقی رہنے والی ہیں بلکہ اپنے طالب کی مطلوبہ بقاء کا بھی سامان رکھتی ہیں۔ یہ حبّ دنیا کی گرفت کمزور کرنے کی واحد اصولی تدبیر ہے تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مرض اتنا گہرا اور پیچیدہ ہے کہ جب تک مریض خود اس سے نکلنے کی جان توڑ کوشش، جسے اصطلاح میں مجاہدہ کہتے ہیں، نہیں کرے گا، پورا افاقہ نہیں ہوسکتا۔　　'ترکِ رذائل' از علامہ احمد جاوید

سادہ لفظوں میں یوں سمجھیں کہ نفس انسانی اپنی محبوب و مطلوب چیز کے معاملے میں کسی پر بھروسہ نہیں

کرتا۔ اس تک رسائی یا نارسائی کے تمام احوال خود تک محدود رکھنا چاہتا ہے اور ان میں کسی کی نسبت یا مداخلت پسند نہیں کرتا۔ دنیا کی محبت اگر پیدا ہو جائے تو یہ صورت لازماً پیش آتی ہے کہ آدمی اس کے سلسلے میں کامیاب ہو یا ناکام، خودمختار اور خود مکتفی رہنا چاہتا ہے۔ اللہ کا حکم، مرضی اور قدرت اس تمنا کے راستے میں رکاوٹوں کی طرح محسوس ہوتی ہیں۔

تزکیۂ نفس

علامہ ابن جوزی

موت —— جسے ہم بھول گئے ہیں

معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا میں منہمک اور اس کے دھوکے میں مبتلا آدمی کا دل لازماً موت کے ذکر سے غافل ہوتا ہے۔ وہ اس کا بالکل تذکرہ نہیں کرتا اور اگر کبھی کرتا ہے تو نفرت کے رنگ میں۔ وہ دنیا

کی ناپائیداری پر افسوس اور موت کی مذمت میں مشغول رہتا ہے اور یوں ایسے آدمی کو موت کا تذکرہ اللہ سے اور دور کر دیتا ہے۔ البتہ توبہ کرنے والا موت کا تذکرہ اس لیے کرتا ہے کہ اس کے دل میں ڈر پیدا ہو اور وہ اپنی توبہ کو پورا کر سکے۔ اس سلسلے میں کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ موت کو اس لیے ناپسند کرتا ہے کہ عقبیٰ کے سفر میں زادِ راہ کی تیاری سے پہلے موت نہ آجائے؛ چنانچہ اس کا موت کو ناپسند کرنا بُرا نہیں۔ یہ آدمی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کے تحت نہیں آتا کہ جو 'اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے'' کیونکہ وہ اللہ کی ملاقات سے اپنی کوتاہیوں اور گناہ کی وجہ سے ڈرتا ہے۔ اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جو دوست کی ملاقات کو اس خیال سے مؤخر کرے کہ اس کی پسند کے مطابق تیاری کرنے کے بعد ملاقات کے لیے جائے گا۔ ایسے آدمی کے لیے یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ ملاقات کو پسند نہیں کرتا اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اس کی تیاری میں لگا رہے۔ بہرحال موت کے تذکرے میں ثواب اور فضیلت ہے۔ دنیا میں غرق آدمی بھی کبھی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے کہ وہ دنیا سے الگ ہو جاتا ہے کیونکہ موت کا تذکرہ دنیا کی نعمتوں کو مکدر کر دیتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لذتوں کو توڑنے والی موت کا اکثر تذکرہ کیا کرو۔ حضرت انسؓ نے کہا کہ ایک آدمی کا تذکرہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ہوا۔ لوگوں نے اس کی بڑی تعریف کی، تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا! یہ آدمی موت کا تذکرہ کس طرح کرتا ہے،؟ انہوں نے کہا کہ ہم نے کبھی اسے موت کا تذکرہ کرتے نہیں سنا تو آپ نے فرمایا: 'تمہارا ساتھی اس درجہ کا نہیں ہے'۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا: 'کون آدمی زیادہ عقل مند ہے،؟ آپؐ نے فرمایا: 'جو موت کا تذکرہ زیادہ کرے اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے اچھی تیاری میں لگا رہے وہی عقل مند ہے'۔ معلوم ہونا چاہیے کہ موت کا خطرہ بڑا عظیم ہے، لوگ اس سے محض قلتِ فکر و ذکر کی وجہ سے غافل ہیں اور اگر کوئی اس کا تذکرہ کرتا بھی ہے تو غافل دل سے کرتا ہے۔ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی تمام خیالات سے کنارہ کش ہو کر موت کا تذکرہ کرے اور یوں سمجھے کہ وہ سامنے سے آرہی ہے۔ اس کا حال ایسا ہو کہ گویا خطرناک جنگل طے کرنا چاہتا ہو یا سمندر کا سفر کر رہا ہو۔ ایسی صورت میں وہ سب سے زیادہ خطرات کے متعلق غور کرے گا۔ اس کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اپنے ان ساتھیوں اور ہم عصروں کو یاد کرے جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان کی موت اور ان کے زمین کے نیچے دفن ہونے کو یاد کیا کرے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا: 'خوش قسمت وہ ہے جو دوسروں سے عبرت حاصل کرے'۔ حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا: 'جب مُردوں کا تذکرہ ہو تو اپنے آپ کو بھی انہی میں سے شمار کرو'۔ حضرت عبدللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے کندھے سے پکڑا اور فرمایا: 'دنیا میں اس طرح رہو جیسے کوئی پردیسی یا راہ چلتا مسافر'۔ وہ کہا کرتے تھے، جب شام ہو جائے تو صبح کی امید نہ رکھ اور جب صبح ہو تو شام کا انتظار نہ کر اور اپنی صحت میں بیماری اور اپنی زندگی میں موت کا سامان کرو'۔ حضرت حسنؓ نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: 'کیا تم سب جنت میں داخل ہونا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا ہاں تو فرمایا، طول امل (یعنی لمبی امیدیں پالنے) سے

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں، یہ ایک مشن ہے، ایک جذبہ ہے اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی اور اتفاق ہے تو کوشش کیجئے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔

خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔

زرِاعانت: فی شمارہ 35روپے　　سالانہ 400روپے

تاحیات 5,000روپے۔ معاون خصوصی 10,000 روپے

چیک بنام ارقم فاؤنڈیشن اور منی آرڈر بنام ناظم دفتر 135-A ہنزہ بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوایئے یا دفتر ہنزہ بلاک میں دستی جمع کروا کر رسید حاصل کیجئے۔

بچو، اپنی موت کو اپنے سامنے رکھو اور اللہ تعالیٰ سے پوری طرح حیا کرو'۔

معلوم ہونا چاہئے کہ طول امل کے دو بڑے سبب ہیں: دنیا سے محبت اور جہالت۔ جب انسان دنیا کی خواہشات، لذتوں اور تعلقات سے مانوس ہوتا ہے تو اس کی جدائی دل پر گراں گزرتی ہے۔ اس کا دل موت کی یاد سے رک جاتا ہے جیسا کہ ہر آدمی اپنی ناپسندیدہ چیز کو اپنے نفس سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ انسان باطل خواہشات میں مشغول رہتا ہے۔ وہ اپنے نفس کو ہمیشہ اپنی مراد کے موافق دنیا

میں باقی رہنے کی امید دلاتا ہے۔ وہ مال، اہل وعیال، مکان وسامان اورضرورت کی چیزوں کے خیال میں اس طرح ڈوبا رہتا ہے کہ اپنی موت سے غافل ہوجاتا ہے۔ اگر کبھی اس کا خیال آ بھی جائے تو اسے آئندہ پر ٹالتا ہے اور اپنے نفس کو یقین دلاتا ہے کہ ابھی تو بہت زندگی پڑی ہے آگے چل کر توبہ کرلوں گا۔ پھر سوچتا ہے بوڑھے ہوکر تائب ہوجاؤں گا۔ اور جب بوڑھا ہوجاتا ہے تو کہتا ہے مکان کی تعمیر سے فارغ ہوجاؤں، اس زمین کو آباد کرلوں، اس سفر سے واپس آجاؤں۔ بس اسی طرح ٹالتا رہتا ہے۔ ایک کام پورا کرنے کی حرص کرتا ہے تو اس کے ساتھ دس شغل اور چمٹ جاتے ہیں یہاں تک کہ موت اسے آکر دبوچ لیتی ہے اور اب یہ بات اس کی سمجھ میں آتی ہے کہ جن کاموں میں وہ الجھا رہا ان میں سے ایک بھی نفع پہنچانے والا نہ تھا۔

دوسرا سبب جہالت ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی اپنی جوانی پر اعتماد کرتا ہے، جوانی میں موت کا آنا بعید سمجھتا ہے اور یہ اس کی بھول ہے۔ اگر وہ اپنے شہر کے بوڑھوں کا شمار کرے انہیں کم پائے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ موت کا کوئی وقت نہیں۔ وہ گرمی، سردی، بہار، خزاں، دن، رات غرض کسی وقت بھی آسکتی ہے اس کے لیے عمر کا کوئی حصہ مخصوص نہیں۔ جوان، ادھیڑ عمر، بوڑھے اور بچے سب پر آتی ہے۔ انسان کے لیے یہی بات اچھی ہے کہ وہ موت کی تیاری کرے (منہاج القاصدین)۔

ہماری سرگرمیاں

☆ ۱۸ دسمبر ۲۰۱۰ء کو جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں دینی مدارس کے اساتذہ کی تربیتی نشست سے صدرتحریک ڈاکٹر محمد امین نے 'دینی مدارس کے نظام تعلیم کو مزید مؤثر کیسے بنایا جائے'؟ کے موضوع پر خطاب کیا۔ اس تقریب سے مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب، مولانا زاہد الراشدی صاحب اور دیگر علماء کرام نے بھی خطاب فرمایا۔

☆ ملی مجلس شرعی کا اجلاس ۶ دسمبر ۲۰۱۰ء کو دفتر تنظیم اسلامی گڑھی شاہو لاہور میں ہوا۔ جس میں سارے مکاتب فکر کے ممتاز علماء کرام نے شرکت کی خصوصاً مولانا زاہد الراشدی، مولانا عبدالرؤف فاروقی، مولانا مفتی محمد خان قادری، علامہ احمد علی قصوری، حافظ عبدالرحمن مدنی، مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی، حافظ صلاح الدین یوسف، قاری شیخ محمد یعقوب، مولانا عبدالمالک، مولانا خلیل الرحمن قادری، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، حافظ عاکف سعید، ڈاکٹر محمد امین وغیرھم۔ ان علماء کرام نے بعد میں پریس کلب میں پریس کانفرنس بھی کی اور توہین رسالت اور مساجد و مزارات پر خودکش حملوں کی مذمت کی جس میں علامہ ڈاکٹر محمد حسین اکبر بھی شامل ہوئے۔

☆ تحریک کے ایک وفد نے، جس میں صدرتحریک ڈاکٹر محمد امین، پروفیسر شاہد رشید، سراج محمود ناصر، عبدالستار ہمدانی اور عبدالرؤف شامل تھے، اسلام آباد میں معروف دانشور اور سیاستدان احسن اقبال، آغا مسعود شورش اور معروف صحافی اور دانشور عرفان صدیقی صاحب سے ملاقات کی۔ وفد نے ۱۹ دسمبر کو پائنیر اسلامک سکول اور جامعہ اسلامیہ للبنات واہ کینٹ

کا دورہ کیا جہاں پروفیسر شاہد رشید اور ڈاکٹر محمد امین نے اساتذہ سے خطاب کیا۔ بعد میں وفد اٹک سے آگے سوجھنڈہ گاؤں گیا اور وہاں کلیۃ العلوم الاسلامیہ کا دورہ کیا اور ادارے کی بہتری اور نصاب وغیرہ سے متعلق مشاورت میں شرکت کی۔

☆ ادارہ مطبوعات طلبہ لاہور نے حال ہی میں صدر تحریک کی کتاب 'ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل' کی طبع نو کا اہتمام کیا ہے۔ تعارفی تقریب ۲۵ دسمبر ۲۰۱۰ء کو ہمدرد سنٹر لاہور میں ہورہی ہے جس کی صدارت جسٹس (ر) خلیل الرحمن خان فرمائیں گے جبکہ مقررین میں پروفیسر ڈاکٹر مہر سعید اختر، اوریا مقبول جان، پروفیسر رشید احمد انگوی اور پروفیسر سلیم منصور خالد شامل ہوں گے (ان شاء اللہ)۔

مدیر کے نام

''البرہان کے مندرجات نہایت عمدہ ہیں مثلاً قرآن، سیرت، دینی تناظر، معاشرت، تزکیۂ نفس، تفہیم مغرب اور ہماری سرگرمیاں۔ امید ہے کہ آپ اس ضمن میں ان مستقل عنوانات کے علاوہ معیشت اور اسلامی نقطۂ نظر اور زندگی کے بارے میں مغرب کے نظریات اور اس کے مقابل قرآن و حدیث کی تعلیمات جدید تناظر میں بھی پیش فرمائیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

آپ سے التماس ہے کہ یہ جو آج کل مغربی امداد کے تحت نیم خواندہ دانشور (Pseudo Intellectuals) پیدا ہو گئے ہیں اور پھر یو ایس ایڈ کے تحت علماء کرام بھی پی سی بھوربن میں نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ دینی اجتماعات کررہے ہیں، اس پر بھی کچھ خامہ فرسائی فرمائیں گے۔ پھر این جی او کے کردار کو بھی زیر بحث لایا جائے کہ اس سے ہمارے معاشرے میں کتنا سدھار اور بہتری وفلاح پھیلی ہے اور کس قدر شر نے جنم لیا ہے۔

مجھے قوی امید ہے کہ آپ لارڈ میکالے کے نظام تعلیم کو بھی تحقیقی وتنقیدی طریقہ سے کسی مقالہ میں پیش فرمانے کا بندوبست کریں گے اور پھر اسی طرح مشرف دور میں جو تعلیمی پالیسی Subtle Subversion کے نام سے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی صورت معرضِ وجود میں لائی گئی تھی اس کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ بھی قوم کے سامنے پیش فرمائیں گے۔

اسی طرح البرہان میں Pew, RAND Corporation اور اسی طرح کے دیگر تھینک ٹینکس مثلاً The Club of Rome، Brookings Institute وغیرہ کی رپورٹوں اور تجزیات اور کتب کے اردو تراجم عوام الناس کی آگہی کے لیے تلخیص کی صورت میں پیش فرمایا کریں گے۔ مغربی پریس سے انتخاب کا مستقل عنوان بھی آپ کی فہرست مضامین میں ضرور شامل ہونا چاہیے۔

تنویر احمد بٹ، کراچی

البرہان: ہم تنویر احمد بٹ صاحب اور دیگر اہل علم سے درخواست کریں گے کہ وہ مذکورہ موضوعات پر قلم اٹھائیں۔ البرہان کا تعاون انہیں، ان شاء اللہ، حاصل ہوگا۔